نبیلہ ابر راجہ

تمہیں کیا معلوم کہ دکھ کیا چیز ہوتے ہیں
کاش تم ریت کے پیاسے ذرے ہوتے
اور بادل کا ٹکڑا تم پر سے بن برسے گزر جاتا
تمہیں تب معلوم ہوتا کہ دکھ کیا چیز ہوتے ہیں
کاش تم خزاں رسیدہ درخت کے پتے ہوتے
اور ٹہنی سے ٹوٹ کر گر جاتے
تب تمہیں معلوم ہوتا دکھ کیا چیز ہوتے ہیں

اوپری منزل پہ ٹیرس کی دیوار پہ آگے کی طرف جھکے جھکے وہ کتنی دیر سے کسی غیر مرئی نکتے پہ نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔ شام کے ڈھلتے سائے آہستہ آہستہ ماحول کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ دھوپ دیواروں سے اترتے ہوئے عجیب سی یاسیت آمیز اداسی کا منظر پیش کر رہی تھی نیچے زرینہ بیگم کی بہن بمعہ اپنی فیملی کے صبح سے آئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد زیان اوپر آگئی تھی۔ اوائل نومبر کی ڈھلتی دھوپ اور گہرے ہوتے سائے اچھی خاصی خنکی کا احساس دلا رہے تھے۔ اسے یہاں بیٹھے دو گھنٹے سے زائد ہو گئے تھے، لیکن نیچے جانے سب کا سامنا کرنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جانے کیوں عجیب سی خود ترسی کا جذبہ خود پہ حاوی ہوتا نظر آرہا تھا۔ اندر ہی اندر لاوا پھوٹ کر بہنے کو بے تاب تھا، مگر یہ آگ آنسوؤں سے کہاں بجھنے والی تھی، اس حقیقت کا ادراک تو اسے بہت پہلے سے تھا۔ تب ہی تو ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ لبوں پہ کرن بن کر چمکی تھی۔

مغرب کی اذان کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ سر پہ دوپٹا درست کرتی وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ آخری زینہ پار کرتے ہی وہاب سے ٹکراؤ ہوا۔ بلیو کلر کی جینز اور میچنگ شرٹ میں ملبوس سلیقے سے بال بنائے وہاب اس کے رستے میں حائل کھڑا تھا۔

"زیان صاحبہ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور تمہیں کچھ ہوش ہی نہیں ہے۔ بے چاروں کو کمپنی ہی دے دو۔" وہاب کے الفاظ میں نرمی و بے تکلفی تھی، مگر لہجہ و انداز میں نرمی کا نشان تک نہ تھا۔ عجیب آنچ دیتا لہجہ تھا۔
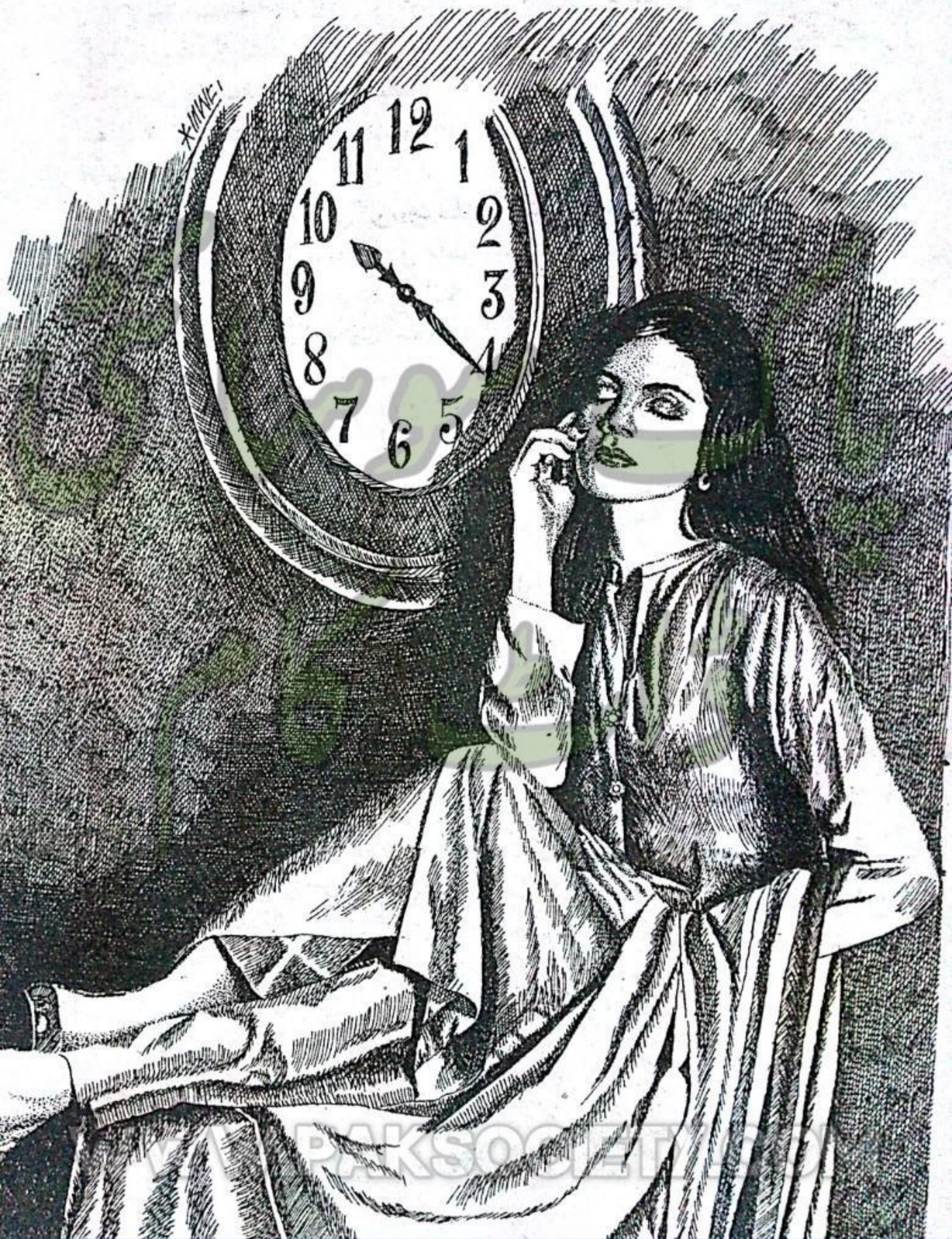
"میں پڑھ رہی تھی۔" اس نے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بولا۔

"کیا پڑھ رہی تھی؟" وہ باقاعدہ جرح پہ اتر آیا۔

"کورس کی بکس تھیں ظاہر ہے۔" وہ چڑسی گئی۔

"تم نیچے سب کے ساتھ بیٹھ کر بھی پڑھ سکتی تھی۔" اس نے آرام سے زیان کے تپے تپے چہرے کو تکتے ہوئے مشورہ دے ڈالا۔ "دٹس اوکے۔" زیان نے اپنا لہجہ مشکل سے نارمل کیا تھا۔ وہاب مطمئن ہوگیا۔

زیان اندر آرہی تھی۔ زرینہ امی بہن روبینہ کے ساتھ باتوں میں لگی تھیں۔ ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "کہاں تھی تم اتنی دیر سے؟" انداز عام اور سوالیہ سا تھا۔ اس سے پہلے کہ زیان آگے بڑھتی روبینہ بول پڑیں۔

"دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو کون سا روز روز تمہارے گھر آتے ہیں۔" انہوں نے بڑے میٹھے لہجے میں طعنہ دیا تو ناچار زیان ان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ زیان کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ باقی سب ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ باتوں اور قہقہوں کی آواز اس کمرے تک آرہی تھی۔

"میں ابو کو دیکھ آؤں ذرا۔" اس نے منظر سے ہٹنے کا بہانہ سوچا اور پھر اس پہ "فوراً" عمل درآمد بھی کردیا۔ زرینہ بیگم اور ان کے دیگر خاندان والوں سے ملنے ملانے کے باوجود زیان اجنبیت ہی محسوس کرتی تھی۔ حالانکہ زرینہ بیگم کو اس کی ماں کی جگہ لیے برسوں گزر چکے تھے' مگر زیان کی غیریت اور احتیاط جوں کی توں تھی۔ ان کے پورے گھر کی تصویر مکمل تھی۔ ایک وہی مس فٹ تھی۔ یہ خامی اسے کبھی کبھی بری طرح محسوس ہوتی۔

✡ ✡ ✡

امیر علی تکیے کے سہارے نیم دراز ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ زیان دبے قدموں آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور ان کے سامنے پڑے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ نہ تو امیر علی نے اسے مخاطب کیا۔ نہ زیان نے اس کی ضرورت سمجھی۔۔۔ وہ ان سب سے جان چھڑا کر یہاں آئی تھی۔ کچھ وقت سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ یہاں گھر کے کسی فرد کی مداخلت کا فی الحال کوئی امکان نہیں تھا۔ زیان نے صوفے پہ بیٹھے بیٹھے رخ ٹی وی کی طرف کرلیا۔

"کیسی جارہی ہے تمہاری پڑھائی۔" خاموشی کے طلسم کو امیر علی کی آواز نے ہی توڑا تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی جو بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ زہر میں ڈوبی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ابھری۔

"بس ٹھیک ہی چل رہی ہے۔" اس کے ایک ایک لفظ سے بے زاری کا عنصر نمایاں تھا۔

"کیوں خیر ہے نا پڑھائی میں کوئی پرابلم تو نہیں۔ اپ سیٹ لگ رہی ہو؟" امیر علی نے بہت سے سوال ایک ساتھ ہی کرڈالے۔

"نہیں۔۔۔" اس نے سب کا جواب مختصر سی نہیں کی صورت میں دیا۔

"تمہیں کوئی بھی پرابلم ہو تو مجھ سے ڈسکس کرسکتی ہو۔" ان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"اب میں اس قابل ہوگئی ہوں کہ اپنے پرابلم خود سولو کرسکتی ہوں۔" امیر علی کو لگ رہا تھا۔ ان کے سامنے زیان نہیں کوئی اجنبی ہو جو سر راہ مل گیا ہو اور رو کے جانے کی صورت میں نکلنے کی کوشش کررہا ہو۔ وہ تو ان کی طرف متوجہ تک نہیں تھی ٹی وی کو گھور رہی تھی۔ جیسے وہی سب سے اہم ہو۔ وہ ان کے پاس ہوتے ہوئے بھی پاس نہیں تھی۔ ذہنی طور پہ میلوں کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔ وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے پس منظر میں چھپی وجوہات سے بھی واقف تھے تب ہی تو بے بس ہو کر پھر سے خاموشی کے خول میں سمٹ گئے۔

زیان اٹھ کر کچن کی طرف آئی۔ جہاں بوا کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔

"بوا کیا ہو رہا ہے؟" زیان نے سبزی کی ٹوکری میں

سے ایک گاجر اٹھائی اور دھونے لگی۔ بوا رحمت نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سے بھنتے مسالے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ پیاز ٹماٹر اچھی طرح مکس ہوکر بھن گئے تھے انہوں نے دھولی ہوئی چکن اٹھا کر ہانڈی میں ڈالی۔ زیان گاجر دھو کر پاس رکھے اسٹول پہ چڑھ کر بیٹھ گئی۔

"وہی روز کے کام دھندے اور کیا کرنا ہے اور تم گاجر کیوں کھا رہی ہو میں نے کباب رکھے ہیں یہ لو۔" کفگیر رکھ کر انہوں نے مائیکروویو میں پڑی پلیٹ نکالی جس میں کباب رکھے تھے۔ انہوں نے کباب انگلی سے چھو کر گرم ہونے کا اطمینان کیا پھر پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"آپ نے کب بنائے؟" اس نے گاجر پھر سے ٹوکری میں رکھ دی۔

ابھی آدھے گھنٹے پہلے چائے کے ساتھ بنا کر سب کو دیے مگر تم نظر ہی نہیں آئی۔"

بوا باتوں کے ساتھ ساتھ چکن کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

"بوا آپ اب اتنے کام مت کیا کریں‘ ثمینہ ہے نا‘ دیکھنے دیں اسے یہ بکھیڑے۔" اس نے کباب کھاتے ہوئے مشورہ دیا۔ بوا ہنس دیں‘ سادہ اور بے ریا ہنسی۔

"مجھے امیر میاں اور اس گھر کے افراد کی خود خدمت کر کے جو خوشی ملتی ہے‘ وہ کام ثمینہ کے سپرد کردوں تو وہم سا لگا رہے گا۔ اس لیے خود کرتی ہوں۔" چکن بھونتے بھونتے انہوں نے نپے تلے انداز میں بات مکمل کی۔ زیان کباب کھاتے کھاتے رک گی۔

"بوا آپ کو اتنی محبت اور خیال ہے‘ ہم سب کا۔"

"یہ محبت تو میرے خون میں رچی بسی ہے۔ اللہ بخشے بڑی بیگم (زیان کی دادی) کو میں ان کے زمانے سے یہاں اس خاندان میں کام کر رہی ہوں۔ چھوٹی بیگم کو امیر میاں میرے سامنے ہی تو رخصت کروا کے لائے تھے۔ اتنا دھوم دھڑ کا تھا۔ اتنی خوشیاں منائی گئی تھیں مجھے سب یاد ہے۔" بوا بتاتے بتاتے ماضی میں پہنچ گئی تھیں جہاں سب روز اول کی طرح روشن تھا۔

زیان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو چلا تھا۔ اس نے ادھ کھایا کباب پلیٹ میں رکھ دیا اور دبے قدموں کچن سے نکل گئی۔ بولتے بولتے بوا کی نظر اسٹول کی طرف اٹھی جو اب زیان کے وجود سے خالی تھا۔ انہوں نے فوراً" دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ زیان باہر نکل رہی تھی۔ بوا کے ہاتھ اور زبان یک دم ہی سست پڑ گئے۔ انجانے میں ہی سہی انہوں نے زیان کے دل میں دبے آگ جیسے زخموں کو ہوا دے ڈالی تھی۔ اب وہ نادم سی تھیں۔ زیان منظر سے غائب تھی۔

☼ ☼ ☼

" Slay With me کا Akcent " فل والیوم میں بج رہا تھا۔ کار کے شیشے تک دھمک سے لرز رہے تھے۔ رنم بہت ریش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ کام سٹ یونیورسٹی کا آہنی گیٹ سامنے تھا۔ گاڑی کی رفتار اس نے میکانکی انداز میں کم کی۔ آدھے گھنٹے کا راستہ اس نے پندرہ منٹ میں طے کیا تھا۔ اس تیز رفتاری سے احمد سیال بھی خائف رہتے تھے۔ پر وہ رنم سیال ہی کیا جو ان کی بات مان لیتی۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں تیز رفتاری اور ساتھ چلنے والوں کو پیچھے چھوڑنے کی قائل تھی۔ لگی بندھی زندگی اور روٹین سے اسے نفرت تھی۔ اس کی رگوں میں خون کی جگہ جیسے پارہ مچلتا تھا۔

"ہائے رنم۔" گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ کر وہ جیسے ہی نکلی پیچھے سے راعنہ کی آواز سن کر رک گئی۔ وہ قریب آچکی تھی۔

"ہائے ہاؤ آر یو۔" رنم نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ جواباً" راعنہ نے اس کے گال سے گال ملا کر ملنے کی رسم پوری کی۔

"فائن تم سناؤ آج کچھ لیٹ آئی ہو۔" دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کلاس روم کی طرف چل دیں۔ "رات کو لیٹ سوئی تھی' اس لیے لیٹ ہوں' لیکن اتنی بھی نہیں۔" اس نے اپنی کلائی میں بندھی قیمتی ریسٹ واچ سرسری سی نظر ڈالی جیسے کچھ جتانا چاہ رہی ہو۔

"ہاں تم ٹائم پہ آتی ہو نا' اس لیے فیل ہوا مجھے۔" راعنہ کا انداز اب دفاعی تھا۔ اس نے رشک سے رنم کے چمکتے پرکشش چہرے کی طرف دیکھا۔ اس نے پنک ٹاپ کے نیچے ٹراؤزر پہنا ہوا تھا اور گلے میں ہلکا سا اسکارف' براؤن بال بڑے غرور سے کندھے پہ پڑے گلابی رخساروں کی بلائیں لے رہے تھے۔ اس کی پوری شخصیت سے آسودگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

کلاس شروع ہونے والی تھی' کیونکہ سر ہمدانی ان کے ساتھ ہی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ "دیکھ لو لیٹ ہونے کے باوجود میں اتنی بھی لیٹ نہیں ہوئی۔" اس کے چمکتے چہرے اور آنکھوں میں غرور تھا۔ دل ہی دل میں راعنہ کو رشک سا ہوا۔ اس کا بے پناہ اعتماد ہی اس کی خوب صورتی کا سرچشمہ تھا۔

اشعر' کومل اور فراز کلاس میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ ان کے پاس پڑی کرسیوں پہ بیٹھ گئیں۔ رنم اور راعنہ کی طرح ان تینوں کا تعلق بھی کھاتے پیتے آسودہ حال خوش حال خاندان سے تھا۔ ان پانچوں کا اپنا گروپ تھا۔ یہ سب بی ایس آنرز چھٹے سمسٹر کے طالب علم تھے۔ کومل اور اشعر خاصے پڑھاکو تھے۔ رنم صرف امتحانات کے دوران پڑھنے والی طالبہ تھی۔ راعنہ کا بھی یہ ہی حال تھا' مگر فراز پڑھائی میں ان سب سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ پانچویں سمسٹر میں اس نے ٹاپ کیا تھا۔ ان چاروں کو پڑھائی میں اگر کوئی مشکل ہوتی تو فراز سے ہی رجوع کرتے۔ رنم اسے بہت کلوز تھی۔ وہ اسے اپنا بیسٹ فرینڈ کہتی تھی۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اسی سے شیئر کرتی۔ فراز بھی اسے اہمیت دیتا۔ ان کی دوستی مثالی تھی۔

سر ہمدانی کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ سب کی نظریں ان پہ جمی تھیں۔

☼ ☼ ☼

گاڑی دائیں طرف نظر آنے والی ذیلی سڑک پہ مڑ چکی تھی۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ سفید عمارت کے پرشکوہ نقوش واضح ہونا شروع ہو گئے

تھے۔ اس کی خوب صورتی کھلنا شروع ہو چکی تھی۔
چند منٹ میں ہی یہ سفر تمام ہوا۔ ڈرائیور نے گیٹ پہ پہنچ کے ہارن دیا۔ گیٹ کے ساتھ دیوار پہ بنی مچان کے اوپر دو باوردی محافظ آتشیں اسلحے سمیت پہرا دے رہے تھے۔ گیٹ کھلا تو ڈرائیور طویل ڈرائیو وے سے گاڑی اندر لے آیا۔

اب وہ ادب سے نیچے اتر کر گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔ ملک ابیک نے گاڑی سے باہر قدم رکھا۔ تاحد نگاہ رہائشی حصے کے باہر سبزہ اور قیمتی پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ وہ نپے تلے باوقار قدموں سے چلتا رہائشی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ لمبا قد' قدرے سرخی لیے گندمی رنگت گہرے بادامی رنگ کی پرسوچ آنکھیں' توانا اور مضبوط جسم پہ سجتا کھدر کا قیمتی کرتا شلوار' اس کی چال میں مضبوطی اور وقار تھا۔ پورے سراپے سے مضبوطی اور نفاست کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ حویلی کے درمیانی حصے میں داخل ہو چکا تھا' یہاں چھت کی بلندی دگنی تھی۔ اسے حویلی کا فیملی لاؤنج سمجھا جا سکتا تھا۔ قیمتی پردے بیش قیمت قالین اور خوب صورت ڈیکوریشن پیسز یہاں کی رونق بڑھا رہے تھے۔

ملک ارسلان اور عنیزہ چچی سے سب سے پہلے سامنا ہوا۔ اس نے پرجوش طریقے سے سلام کیا۔ ملک ارسلان نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ ان کے روم روم میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ ساتھ ایک حسرت ناتمام بھی دل کے کسی کونے کھدرے سے نکل کر سامنے آگئی۔

"کیسے ہو ابیک؟" انہوں نے پرجوش مصافحہ و معانقے کے بعد خیر خیریت دریافت کی۔

"چچا جان الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں' حویلی میں سب ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں سب ٹھیک ہے' لیکن تم نے شہر میں بڑے دن لگا دیے۔" ارسلان اس کے چوڑے کندھے پہ ہاتھ رکھے اس کے جوان کڑیل سراپے کو بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں اب صوفے پہ بیٹھ گئے تھے۔ عنیزہ چچی بھی ساتھ تھیں۔

"کچھ مصروفیت تھی' اس وجہ سے تھوڑا زیادہ ٹائم لگ گیا۔ بابا جان نظر نہیں آرہے ہیں۔" اس کی متلاشی نگاہیں ان ہی کو کھوج رہی تھیں۔

"بھائی جان اپنے کمرے میں ان کی طبیعت ناساز سی ہے۔"

"کیا ہوا ہے بابا جان کو۔" ملک ارسلان کے بتانے پہ وہ مضطرب ہو گیا۔

"بھائی جان کو موسمی بخار اور نزلہ زکام ہے اور کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔" ملک ارسلان نے اس کی فکرمندی دیکھتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بابا جان کی خیر خبر لے لوں۔" لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ چلا گیا۔ ملک ارسلان اور عنیزہ اپنی باتوں میں لگ گئے' مگر موضوع گفتگو ملک ابیک ہی تھا۔

بابا جان کمبل اوڑھے بیڈ پہ نیم دراز تھے۔ پاس ہی افشاں بیگم بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ ملک ابیک کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھیں۔

"کب آئے تم۔" انہوں نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما' وہ بیڈ پہ بابا جان پاس بیٹھ گیا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" ملک جہانگیر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"بابا جان میں تو ٹھیک ہوں' آپ نے کیوں طبیعت خراب کرلی ہے۔" اس کے لہجے میں محبت آمیز احترام کی آمیزش تھی۔

"موسمی نزلہ زکام ہے' ٹھیک ہو جاؤں گا۔ موسم بدلتے ہی میں بیمار پڑ جاتا ہوں۔ بوڑھا جو ہو گیا ہوں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا اب۔" وہ دھیرے دھیرے سے مسکرا رہے تھے۔

"ارسلان چاچا ہیں نا' انہیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے دیں' آپ صرف آرام کریں۔"

"میں سارا دن آرام ہی تو کرتا ہوں اور کیا کرنا ہے اب میرے دو کڑیل جوان بیٹے ہیں' سب کچھ ان کے حوالے کر کے اللہ اللہ کرنا ہے بس۔" وہ بڑے بشاش نظر آرہے تھے۔ افشاں بیگم تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد

کچن کی طرف آگئیں۔ ملک ایبک اتنے دنوں بعد آیا تھا ممتا سے ان کا دل لبریز ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک چیز اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانا چاہ رہی تھیں۔ تینوں نوکرانیوں کو انہوں نے کھانے پکانے پہ لگا دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے لاڈلے بیٹے کے لیے سیب کاٹنے لگیں۔ معاذ ملک تو پاکستان سے باہر تھا۔ ان کی ساری محبت و توجہ کا محور فی الحال ایبک ہی تھا۔ وہ اس کے لیے کٹے سیب اور انواع و اقسام کے پھل لے کر واپس آئیں تو ارسلان ملک بھی وہاں موجود تھے۔ ملک جہانگیر اب ہشاش بشاش ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

"میں تو کہتا ہوں اب ملک ایبک کی شادی ہو جانی چاہیے' تاکہ "ملک محل" میں بہار آجائے۔" ملک ارسلان نے شرارت سے ایبک کو تکتے ہوئے ملک جہانگیر کو مشورہ دیا۔

"میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ اب اس کام میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے' لیکن معاذ پاکستان آجائے تو لگے ہاتھوں اس کے لیے بھی لڑکی دیکھ لوں۔" انہوں نے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایبک قطعا" ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ "کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟"

"لڑکیاں تو بہت ہیں' مگر میں اپنے بیٹے کی پسند کی دلہن لاؤں گی۔" اس سے پہلے کہ ملک جہانگیر کوئی جواب دیتے افشاں بیگم بول پڑیں۔ اس سے پہلے کہ مزید اس موضوع پہ بات ہوتی ملازم نے باہر مردانے میں مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی تو تینوں مرد اس طرف چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

زیان کالج ہال میں دیگر اسٹوڈنٹس سمیت ڈرامے کی ریہرسل کر رہی تھی۔ ڈرامہ فورتھ ایر کی آمنہ رحمان نے لکھا تھا اور فورتھ ایرز کی طالبات ہی ایکٹ کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک زیان بھی تھی۔ ڈرامے میں اس کا رول لڑاکا اور شکی مزاج سخت دل شوہر کا تھا۔ گیٹ اپ اور آواز بدلنے میں زیان کو مہارت حاصل تھی۔ تب ہی تو اسے اس رول کے لیے موزوں ترین قرار دیا گیا تھا۔ اسے شروع سے ہی اکیلے میں خود سے باتیں کرنے کی عادت تھی۔ یہ عادت اداکاری کے شوق میں کب ڈھلی ٹھیک طرح سے اس کا علم زیان کو بھی نہ تھا۔

اس کی موٹی موٹی غلافی آنکھیں تاثرات دینے میں لاجواب تھیں۔ وہ اپنے ڈائیلاگز کی ریہرسل کر رہی تھی۔ اس کی بیوی کا رول بی ایس سی کی صندل منور ادا کر رہی تھی۔ دونوں اس وقت مکمل گیٹ اپ میں تھیں۔ آج فائنل ریہرسل تھی۔ قدرے دبے ہوئے پھولوں کے پرنٹ والے کپڑوں میں ملبوس بکھرے بالوں میں صندل منور ڈری سہمی بیوی کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ زیان کا گیٹ اپ مردوں والا تھا۔ امیر علی کے براؤن کلر کے کرتے شلوار میں ملبوس سر کے بالوں کو پگڑی میں چھپائے مصنوعی مونچھیں لگائے وہ مکمل طور پہ بدلے حلیے میں تھی۔ اپنے مکالمے مردانہ لب و لہجے میں گھن گرج کے ساتھ ادا کرتے ہوئے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ ہی زیان ہے۔

میڈم فریحہ نے تالیاں بجا کر اپنے اطمینان کا اظہار کیا تو وہ دونوں آکر کرسیوں پہ بیٹھ گئیں۔ اب اگلی ریہرسل شروع تھی۔ میڈم فریحہ ڈرامیٹک سوسائٹی کی انچارج اور کرتا دھرتا تھیں۔ کالج میں ہونے والی ایسی تمام غیر نصابی سرگرمیوں کو انہوں نے اپنی محنت سے بھرپور بنانا ہوتا تھا۔

زیان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ میڈم فریحہ سے اجازت لے کر کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ اب وہ کالج کے سفید یونیفارم اور سفید ہی ڈوپٹے میں ملبوس تھی۔ اپنے اصل حلیے میں لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہی زیان ہے' جو تھوڑی دیر پیشتر ایک ظالم جابر شوہر کا رول ادا کر رہی تھی۔

میڈم فریحہ بڑے مزے میں اکثر اسے مشورہ دیتی کہ ایکٹنگ کے میدان میں آجاؤ۔ آج بھی حسب سابق انہوں نے پرانی باتیں دہرائیں۔ "زیان تم ٹی وی کا رخ

کرو، بہت صلاحیتیں ہیں تم میں' ایک اچھی اداکارہ بن سکتی ہو۔ تمہارے فیس ایکسپریشنز بالکل نیچرل ہیں۔ ڈرامہ انڈسٹری میں تہلکہ مچاسکتی ہو۔" وہ سن کر مسکرا دی۔

"میڈم جس خاندان سے میرا تعلق ہے وہاں شوبز کو گالی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں نہیں کرپاؤں گی۔" اس کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میڈم فریحہ نے کندھے اچکائے' جیسے کہہ رہی ہوں تمہاری مرضی۔ ادھر دل ہی دل میں زیان کو جانے کیوں یک دم غصہ آگیا تھا۔ "ہاہاہا.... اچھی اداکارہ... نیچرل ایکسپریشنز۔" میڈم فریحہ کی باتیں دل میں دہراتے ہوئے طنزیہ ہنسی ہنس رہی تھی۔

اس کیفیت کے زیر اثر وہ گھر پہنچی۔ دروازہ اس کی چھوٹی بہن رابیل نے کھولا۔ اس نے ہلکی آواز میں سلام کیا۔ جواباً" رابیل نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ زیان اندر آگئی۔ بیگ رکھ کر وہ برآمدے میں لگے واش بیسن سے منہ ہاتھ دھونے لگی۔

سامنے کچن کے دروازے سے رحمت بوا کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر وہ کھانا گرم کررہی تھیں۔ زیان منہ' ہاتھ دھو کر یونیفارم میں ہی کچن کی طرف چلی آئی۔ آج بھوک زوروں پہ تھی۔ صبح ناشتے کے نام پہ اس نے چند گھونٹ چائے پی تھی۔ پھر کالج میں سارا دن ڈرامے کی بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ کینٹین جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"بوا کیا پکایا ہے؟" بھوک اسے مزید برداشت نہیں ہورہی تھی۔

"مٹر قیمہ اور ساتھ میں چاول ہیں' کہو تو دو کباب بھی فرائی کردوں؟" بوا پلیٹ میں کھانا نکال رہی تھیں۔

"جو مرضی ہے کریں' لیکن پہلے میں چاول کھاؤں گی۔" وہ کچن میں پڑی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کے گرد کرسی گھسیٹ کر بیٹھ چکی تھی۔ بوا فریج سے کباب نکال کر تل رہی تھیں۔ ساتھ اسے سارے دن کی روداد سنا رہی تھیں۔ وہ رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے زیان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" امیر احمد کے گرد کمبل ٹھیک کرتے ہوئے زرینہ بیگم نے اچانک یہ عجیب سوال کردیا۔ امیر احمد نے بھنویں اچکاتے ہوئے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں "کیا؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

"کمال ہے آپ جوان بیٹی کے باپ ہوکر یہ کہہ رہے ہیں۔" زرینہ بیگم نے جیسے نامحسوس انداز میں ان پہ طنز کیا۔

"کھل کر بات کرو۔" الجھن بدستور ان کے لہجے میں موجود تھی۔

"زیان اس سال اپنی کالج کی تعلیم مکمل کرلے گی۔" زرینہ بیگم نے سنبھل کر بات کا آغاز کیا۔

"تو....؟" امیر احمد نے پھر سے اپنی سوالیہ نگاہیں ان پہ ٹکائیں۔

"تو آپ نے اس کی شادی وغیرہ کا کچھ نہیں سوچا۔" اس بار اطمینان کی سانس ان کے سینے سے خارج ہوئی۔ "پہلے وہ تعلیم تو مکمل کرلے' پھر سوچیں گے اس پہ۔"

"لڑکیوں کو مناسب وقت پہ اپنے گھربار کا کردینا چاہیے' تعلیم وغیرہ شادی سے ضروری تو نہیں۔" زرینہ بیگم اپنے اختلاف سمیت آہستہ آہستہ سامنے آرہی تھیں۔

"زیان کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے...." انہوں نے اچانک بات ادھوری چھوڑ دی تو زرینہ بیگم کے چہرے پہ غصہ نظر آنے لگا۔

"تو کیا ساری عمر اسے پڑھانے کا ارادہ ہے؟" چبھتے ہوئے لہجے میں طنزیہ استفسار تھا۔

"میں نے ساری عمر نادانستگی میں اسے نظرانداز کیا ہے۔ میری بیٹی مجھ سے دور ہوگئی ہے' کم سے کم میں اس کی یہ خواہش نظرانداز نہیں کرسکتا۔" ان کے لہجے میں احساس زیاں بول رہا تھا۔ جس نے سر سے

پاؤں تک زرینہ بیگم کو جھلسا دیا۔

"ہاں.... ہاں آپ کیوں اس کی کوئی خواہش نظر انداز کریں گے۔ آپ کی چہیتی کی اولاد جو ہے۔" امیر احمد نے زخمی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو' میں نے زیان کے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے' وہ متنفر ہے مجھ سے.... میں نہیں چاہتا اس کی دیرینہ خواہش کے راستے میں رکاوٹ بنوں۔"

"لیکن میں اب اسے اور اس گھر میں برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کے بعد رابیل بھی ہے مجھے اس کا بھی سوچنا ہے۔"

"رابیل ابھی بہت چھوٹی ہے' اللہ اچھا کرے گا۔" امیر احمد کے انداز میں شکست نمایاں تھی۔

"آپ کو کیا پتا بیٹیوں کے رشتے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں' ابھی سے زیان کے لیے کوشش کا آغاز کروں گی تو کچھ ہوگا نا۔ میں دیکھ بھال کر زیان کے لیے اچھا رشتہ ہی تلاش کروں گی' دشمن نہیں ہوں اس کی ماں ہوں۔" امیر احمد کی پسپائی دیکھ کر وہ بھی نرم پڑ گئی تھیں۔

تب ہی دروازے پہ مخصوص دستک کی آواز ابھری' یہ بوا رحمت تھیں جو سونے سے پہلے معمول کے مطابق ان کے لیے خود دودھ لے کر آئی تھیں۔ زرینہ نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا' مگر وہاں بے نیازی تھی' کوئی کھوج' کوئی بھید کوشش کے باوجود بھی وہ تلاشنے میں ناکام رہیں۔ وہ دودھ رکھ کر جاچکی تھیں۔ دروازہ پہلے کی طرح بند تھا۔

زرینہ نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے دودھ کے گلاسوں سے اٹھتی بھاپ کی طرف نگاہ جمادی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ بوا نے ابھی ابھی دودھ گرم کیا ہے۔ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ پھر سے امیر احمد کی طرف متوجہ ہوئیں اور باتوں کا ٹوٹا سلسلہ وہیں سے جوڑنا چاہا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

"ہاں جو تمہیں اچھا' مناسب لگتا ہے کرو۔" ایک بھرپور قسم کی پسپائی امیر احمد کے پورے وجود سے جھانک رہی تھی۔ زرینہ بیگم کو یک گونہ اطمینان کا احساس ہوا۔ وہ شروع سے فاتح رہی تھیں۔ اس محاذ پہ بھی امیر احمد نے لڑے بغیر ہتھیار پھینک دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

بوا نے پورے گھر کا چکر لیا اور سب دروازے چیک کیے۔ یہ ان کا پرانا معمول تھا جس پہ وہ برسوں سے کاربند تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ ایک بار پھر زیان کے کمرے کے سامنے رکیں۔ ہاتھ سے دروازے پہ دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے لاک تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی سوچتی رہیں اور پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ وہ جب دودھ لے کر امیر احمد کے کمرے کی طرف جارہی تھیں تو زرینہ بیگم کی کچھ باتیں دروازہ بند ہونے کے باوجود بھی ان کے کانوں میں پڑ گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اونچی آواز میں بولنے کی عادی تھیں۔ بوا کی عمر کا بیشتر حصہ اسی گھر کے مکینوں کے ساتھ گزرا تھا۔ وہ زرینہ بیگم سے بھی پہلے یہاں تھیں۔ زمانے کے سرد و گرم سے آشنا اور جہاں دیدہ تھیں۔ زرینہ بیگم کا اول دن سے ہی زیان کے ساتھ رویہ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

انہوں نے زیان کو امیر احمد کی بیٹی نہیں اپنی حریف سمجھا تھا۔ بوا کا دل اس سلوک پہ احتجاج کرتا' لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ ہاں زیان کے لیے ان کی محبت توجہ پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ وہ ہر ممکن اس کی دلجوئی کرتیں۔ اب زرینہ بیگم نے جو اچانک شادی کا شوشہ چھوڑا تھا۔ وہ بلاوجہ نہیں تھا۔ گھر میں سب کو ہی پتا تھا زیان کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کا بے پناہ شوق ہے۔

اس کے ارادے بلند تھے۔ وہ گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ سو اس کی تمام تر توجہ اپنی پڑھائی پہ تھی اور اس پہ وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کی قائل نہیں تھی۔ ایسے میں اپنی شادی کا ذکر اسے مشتعل کرسکتا تھا۔ بوا آنے والے وقت کے خیال سے پریشان تھیں۔

☆ ☆ ☆

یونی ورسٹی کے وسیع سبزہ زار پہ دھوپ نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ کلاسز آف ہونے کے بعد وہ پانچوں کے پانچوں پھسکڑا مار کر ادھر ہی بیٹھے گئے تھے۔ رنم نے کومل کے کندھے سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے چہرے پہ کوفت کے آثار تھے۔ راعنہ نے سبب دریافت کیا تو وہ پھٹ سی پڑی۔

"کتنے دن ہوگئے ہیں' نہ کوئی پارٹی' نہ پکنک' نہ موج مستی' نہ ہنگامہ۔۔۔ میں روٹین لائف سے بور ہوگئی ہوں۔" اس کے چہرے پہ دنیا جہان کی بےزاری تھی۔ رنم نے پیار سے اس کے بال سلائے اور اس کے کندھے سے اپنا سر اٹھالیا۔

"تو کیا خیال ہے' رات کو Base ment night club نہ چلا جائے؟" اس نے باری باری سب کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھا تو سب سے پہلے اشعر نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔

"واؤ ونڈر فل آئیڈیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے انجوائے منٹ رہے گی۔" راعنہ بھی راضی تھی۔

"او کے ڈن ہے رات کو چلیں گے۔" رنم فیصلہ کن لہجے میں بولی تو سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب میں تو گھر جارہا ہوں۔" فراز سب سے پہلے اٹھا۔ وہ کی رنگ جھلاتا پارکنگ ایریا کی طرف آیا تو رنم بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تینوں کو سی یو بول کر وہ اپنی گاڑی نکالنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بڑی طوفانی رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتی ایف ایٹ ون کی طرف جارہی تھی' جہاں اس کی جنت اس کا گھر تھا۔

☆ ☆ ☆

احمد سیال ڈیلی گیشن کے ساتھ مصروف تھے۔ انہوں نے رنم کو اپنی مصروفیات سے آگاہ کردیا تھا۔ اس لیے وہ اندھیرا چھاتے ہی اپنی تیاری میں لگ گئی تھی۔ پارٹیز' پکنک' ہلا گلا' سیرو تفریح میں اس کی جان تھی۔ ہر ہفتے وقت نکال کر وہ سب فرینڈز اپنی اپنی پسندیدہ ایکٹوٹیز سے لطف اندوز ہوتے رنم پیش پیش ہوتی۔

اپنے پسندیدہ بلیک کلر کے ڈریس میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی کے دو آتشہ ہونے میں کلام نہیں تھا۔ اپنے حسن اور کشش کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس بات اور احساس نے اسے بے پناہ اعتماد بخشا تھا۔ وہ بہت سے لوگوں میں الگ سے ہی پہچانی جاتی۔

وہ سب دوست ہائی سوسائٹی کے اس کلب کے باقاعدہ رکن تھے۔ احمد سیال کی بیٹی ہونے کے ناطے اور پھر اپنی بے پناہ خوب صورتی کی وجہ سے گمنام نہیں رہی تھی۔ سب اسے اچھی طرح جانتے تھے اور اسی حساب سے پروٹوکول بھی دیتے۔ آج بہت دن بعد سب دوست کلب میں اکٹھے ہوئے تھے۔

ڈانسنگ فلور پہ شوخ مغربی دھن پہ نوجوان جوڑے قدم سے قدم ملائے رقص کررہے تھے۔ رنم کو بذات خود ڈانس اور موسیقی کے اس مظاہرے سے دلچسپی نہیں تھی۔ پر اسے نوجوان جوڑوں کی یہ حرکات محظوظ کرتی۔ ہال کے چاروں طرف مخصوص فاصلے کی حد میں چھوٹی چھوٹی گول میزیں اور ان کے گرد کرسیاں بڑی تھیں۔ جو رقص سے تھک کر آرام کرنے والوں کے کام آتیں۔ راعنہ' رنم اور فراز تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے' جبکہ کومل' اشعر ڈانسنگ فلور پہ دوسرے جوڑوں کے ساتھ رقص کررہے تھے۔

وہ تینوں دوست ان ہی کے بارے میں بات کررہے تھے۔ اشعر نے تین ماہ پہلے کومل کو پرپوز کیا تھا۔ اس نے اشعر سے سوچنے کے لیے مہلت مانگی اور ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا' یہ بات انہیں فکر مند کررہی تھی۔ کومل سیدھے سیدھے ہاں کیوں نہیں کردیتی۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی اور لگاؤ تھا۔ رہی ان کی محبت تو وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود بھی کومل سوچنے کے لیے وقت مانگ رہی تھی۔

"رنم تم نے کیا پلان کیا ہے فیوچر کے لیے؟" راعنہ

نے ایک دم سوال کر کے موضوع بدل دیا۔

"پلان کیا کرنا ہے' بس لائف کو انجوائے کر رہی ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ راعنہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اوہو.... آئی مین تم نے لائف پارٹنر' شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" اس بار فراز بھی دھیان دینے پہ مجبور ہو گیا۔

"ابھی بہت ٹائم ہے یار۔" اس نے بات ہنسی میں اڑا دی تو راعنہ کا منہ سا بن گیا۔ رنم اتنی آسانی سے کسی کو اپنی سوچوں تک رسائی حاصل کرنے نہیں دیتی تھی۔

خود سر اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال' فراز دونوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ان کی گفتگو میں دخل نہیں دیا۔ اس کی یہ عادت کم سے کم رنم کو بہت پسند تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے فراز اس کا خاموش حمایتی ہو۔ رنم کی مخالفت کرنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔

اس کی یہ خاموشی اور حمایت بہت دفعہ راعنہ کو شک میں ڈالتی کہ فراز کے دل میں رنم کے لیے کوئی نہ کوئی سوفٹ کارنر ضرور ہے۔ ورنہ تقریر کرنے' دلائل دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ رنم اسے اپنا سب سے بہترین دوست کہتی اور یہ بات صرف کہنے یا دعوا کی حد تک نہیں تھی۔ ان کی ایک ایک حرکت سے اس کا اظہار ہوتا کہ فراز اور وہ ایک دوسرے کے لیے بے پناہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے "وہ خاص جذبہ" بھی رکھتے ہیں۔ کم سے کم راعنہ ابھی تک اس کا سرا پکڑ نہیں پائی تھی۔ "خیر مجھے کیا جو بھی ہے۔" راعنہ انہیں نظرانداز کر کے رقص دیکھنے لگی۔

✡ ✡ ✡

ملک جہانگیر کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔ تب ہی تو وہ ڈیرے پہ آئے تھے۔ ڈیرے پہ روز محفل جمتی' ان کے دوست احباب' مزارعے' عام لوگ ضرورت مند' اپنی اپنی مشکلات' مسائل' لڑائی' جھگڑے لے کر ان کے پاس آتے۔ وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ بے انتہا نرم دل اور مہربان تب ہی تو ان کے پاس آنے والے دعائیں دیتے رخصت ہوتے' ملک جہانگیر نے اپنے پرکھوں کی عزت و روایت ابھی تک قائم رکھی ہوئی تھی۔ ملک ایبک بھی ان کے ساتھ ڈیرے پہ موجود تھا۔ دوپہر کے بعد ملنے ملانے والے اٹھ کر گئے تو ملک ایبک ان کے ساتھ ڈیرے سے باہر آگیا۔ کھیتوں کے کنارے بنی پگڈنڈی پہ دونوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ ملک جہانگیر کی صحت پہلے جیسی نہیں رہ تھی' ان کی حرکات میں سستی اور کمزوری تھی۔ ایبک صرف ان کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا۔

تاحد نظر سبزہ اور ہریالی تھی۔ پنجاب کے مغربی حصے میں واقع یہ گاؤں ملک جہانگیر کے آباؤ اجداد نے آباد کیا تھا۔ یہاں کی مٹی بڑی زرخیز تھی۔ ہر سال مختلف پھلوں' سبزیوں اور فصلوں کی بہترین پیداوار ہوتی جو گاؤں سے شہر کی منڈیوں تک پہنچائی جاتی۔ پہلے ملک جہانگیر ان سب کاموں کی نگرانی خود کرتے تھے۔ کیونکہ ملک ایبک اور ملک معاذ تب اپنی اپنی تعلیم کے سلسلے میں گاؤں سے باہر تھے۔ ایبک تو اپنی انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر چکا تھا' جبکہ معاذ اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر ملک سے باہر تھا۔

ایبک کے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اب تمام امور کی انجام دہی' ذمہ داری سب اسی کے سپرد تھی۔ اس کا ایک پاؤں شہر تو ایک گاؤں میں ہوتا۔ شہر میں بزنس کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ وہ کچھ فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش تھا۔ ملک جہانگیر اس سے بے پناہ خوش تھے۔ وہ عادات و اطوار میں ہو بہو ان کا پر تو تھا۔

"بابا جان میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا ہے۔" اس کی بات پہ ملک جہانگیر کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ اس کی طرف پلٹے۔ "کیسا منصوبہ پتر۔"

"بابا جان میں چاہتا ہوں کہ شہر کی طرح گاؤں میں بھی کچھ فلاحی منصوبوں پہ کام شروع کیا جائے۔"

"پتر تمہاری بات میں بڑی جان ہے، مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم اپنے علاوہ بھی کچھ سوچتے ہو۔ تم نے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تھنک یو بابا جان۔ میں اس پہ جلد ہی پیپر ورک کروں گا۔" ان کی طرف سے تائید اور حوصلہ افزائی پا کر وہ بہت مسرور تھا۔

"کرو پتر نیک کام میں دیر کیسی۔" ان کے چہرے پہ بیٹے کے لیے محبت و شفقت تھی۔ ابیک نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"بابا جان آیئے میں آپ کو جیپ تک چھوڑ کر آتا ہوں، میں بعد میں مزارعوں سے مل کر زمینوں کا ایک چکر لگا کر آؤں گا۔" ملک جہانگیر کا سانس بار بار پھول رہا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے وہ اور بھی سست ہو رہے تھے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ گویا انہیں واپس جانے پہ اعتراض نہیں تھا۔ وہ خود انہیں جیپ تک چھوڑ کر آیا۔ رحیم داد نے فوراً" سے بیشتر گاڑی اسٹارٹ کی اور ملک جہانگیر کو حویلی لے کر روانہ ہو گیا۔

جیپ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو تب ابیک نے قدم آگے بڑھائے۔ کھیتوں سے ہرے ہرے پھلوں کے باغات کا سلسلہ شروع تھا۔ وہ پیدل چلتا ادھر جا رہا تھا۔ فضا میں سیب، لیموں اور مالٹے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس نے پوری سانس لے کر اس مہک کو گویا اپنے سینے میں اتارا۔

مزارعے باغوں میں اپنے انجام کی فرائض دہی میں مصروف تھے۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر سب ہی ہوشیار ہو گئے۔ ابیک نے سب سے دعا سلام کی۔ وہ اس وقت مالٹوں کے باغ میں تھا۔ تاحد نظر مالٹے کے پیڑ ہی پیڑ نظر آ رہے تھے۔ موسمی پھل سے لدے پیڑ اس امر کی نشان دہی کر رہے تھے کہ اس بار خوب پیداوار ہوئی ہے۔ اسے دلی اطمینان سا محسوس ہوا۔

باغات سے آگے کافی زمین خالی پڑی تھی۔ وہ اس طرف آ کر کھوجتی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ یہ خالی قطعہ اراضی اس کے منصوبے کے لیے عین مناسب تھی۔ واپس جا کر اس نے اس سلسلے میں عملی اقدام کرنا تھا۔ کچھ پہلو اس کے ذہن میں واضح تھے۔ کچھ کے بارے میں غور و فکر کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

موسم کے تیور آج کافی شدت پہ مائل تھے۔ معمول سے زیادہ سردی ماحول میں رچی بسی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ زیان نے سردی سے ٹھٹھرتے ہاتھوں کو آپس میں رگڑا۔ وہ صحن میں ٹہلنے کے ارادے سے نکلی تھی۔ دھوپ دیواروں سے ڈھلنے کی تیاری میں تھی۔ وہ جوں ہی صحن میں آئی، ایک ثانیے کے لیے کپکپا سی گئی، کیونکہ باہر سرد ہواؤں کا راج تھا۔ اس نے گرم شال مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لی۔ چند چکر لگانے کے بعد جب دانت سردی سے بجنے لگے تو اس نے کمرے کی راہ لی۔ وہ مڑ کر واپس ہونے کو تھی، جب اپنے پیچھے وہاب کی پرجوش اور شوخ آواز سنائی دی۔

"حسین لوگو السلام علیکم!" وہاب کی کھنکتی آواز پہ خود بہ خود ہی اس کے قدم رکے اور اس نے ایک ثانیے کے لیے رخ موڑ کر وہاب کی طرف دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔" اس کا عام سا لہجہ اور انداز کسی بھی قسم کے جذبے سے عاری تھا۔ وہاب کو دکھ سا ہوا۔

"آنٹی اندر ہیں۔" وہ ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کر کے بوا کی طرف آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاب چلا گیا ہو گا زرینہ بیگم کی طرف، مگر وہ تو اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گیا جہاں بوا چائے بنانے میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائیں۔

"کیسے ہیں وہاب میاں۔" ان کے لہجے میں احترام کے ساتھ محبت بھی تھی۔ وہاب نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ اس کی تمام تر توجہ زیان کی طرف تھی۔ جو اب اسٹول پہ بیٹھی پاؤں ہلا رہی تھی۔ ریڈ کلر کے امبرائیڈری والے سوٹ اور شال میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ مناسب قد و قامت

پرکشش چہرہ گہری غزالی آنکھیں وہ حسن مجسم تھی۔ اس کے حسن بلاخیز نے وہاب کے دن رات کا سکون و قرار لوٹ لیا تھا۔ وہ ابھی تک اس پہ اپنا حال آشکارا نہ کرپایا تھا۔ کیونکہ زیان کی سردمہری بے گانگی اسے یہ ہمت کرنے ہی نہیں دیتی تھی۔

"وہاب میاں آپ اندر چلیں، میں چائے لاتی ہوں۔" اسے دروازے پہ ہنوز ایستادہ دیکھ کر انہوں نے جیسے اسے کوئی احساس دلانے کی کوشش کی تو وہ کھسیانا سا ہو کر بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ زیان وہیں اسٹول پہ براجمان نولفٹ کا مکمل اشتہار بنی ہوئی تھی۔

وہ مایوس ہو کر زرینہ خالہ کی طرف آگیا۔

"کب آئے تم۔" انہوں نے بوا کی معیت میں اسے آتا دیکھ کر فوراً" سوال کیا۔ بوا چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ تھیں۔

"ابھی آیا ہوں بس۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ بوا چائے رکھ کر پلٹ گئی تھیں۔ جواباً" انہوں نے وہاب کو تیکھی نگاہوں سے دیکھا، پروہ نظرانداز کر کے پیالی میں چائے ڈالنے لگا۔

رات آخری پہر میں داخل ہونے کو تھی، پر نیند وہاب کی آنکھوں سے کوسوں دور کھڑی ہاتھ مل رہی تھی۔ سخت سردی کے باوجود اس کا لحاف تہ کیا ہوا بستر کی پائنتی کی طرف رکھا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ زیان سرخ لباس میں ملبوس جیسے اس کے کمرے میں گھوم پھر رہی تھی۔ وہ اس کے حسن بلاخیز کے سامنے مکمل طور پہ کب کا سرنگوں ہوچکا تھا۔ وہاب کے دل میں زیان کو حاصل کرنے کی تمنا پچھلے چار سال سے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ لیکن ان چار سالوں میں وہ ایک بار بھی حال دل کہنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوپایا تھا۔ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ بات اس کی مردانگی کے لیے چیلنج بنتی جارہی تھی۔

"میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا زیان امیر احمد۔" اس نے ہتھیلی کا مکہ بنا کر دوسرے ہاتھ پہ مارا۔ وہاب کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور چہرے پہ پراسرار مسکراہٹ۔

☆ ☆ ☆

فون مسلسل دھیمے سروں میں گنگنا رہا تھا۔

احمد سیال نے سامنے ساگوان کی ٹیبل پہ پڑا موبائل فون آن کر کے کان سے لگایا۔ "ہیلو" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے تو دوسری طرف سے والہانہ انداز میں سلام کا جواب ملا۔ یہ ملک جہانگیر تھے، ان کے گہرے اور بے تکلف دوست۔ تین سال سے دونوں کی آپس میں ملاقات نہیں ہوئی تھی، لیکن وقتاً" فوقتاً" فون پہ رابطہ رہا کرتا۔

"اوہ تو آپ ہیں ملک صاحب۔" وہ مسکرا رہے تھے۔

"جی یہ میں ہی ہوں احمد سیال۔" جواباً" وہ بھی بے تکلفی سے گویا ہوئے۔ "تم نے تو نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے، میں نے سوچا خود فون کر کے تمہاری خیریت پوچھ لوں۔"

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے، بزنس کے سلسلے میں کبھی یہاں کبھی وہاں ہوتا ہوں، پاکستان سے باہر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کاروباری بکھیڑوں میں ایسا پھنسا ہوں کہ میری اکلوتی بیٹی بھی شکایت پہ اتر آئی ہے۔ بہت دل چاہتا ہے پرانے دوستوں کے ساتھ محفل جماؤں، لیکن یہ وقت کی کمی آڑے آجاتی ہے۔" احمد سیال کے لہجے میں شرمندگی بے بسی نمایاں تھی۔ ملک جہانگیر نے مزید شکوے، شکایتوں کا ارادہ ملتوی کردیا۔

"تمہاری بیٹی کیسی ہے اب؟"

"وہ ہاں! رنم بالکل ٹھیک ہے۔"

"اب تو کافی بڑی ہوگئی ہوگی۔" ملک جہانگیر آٹھ نو سال پہلے رنم کو دیکھا تھا۔ جب وہ مری میں زیر تعلیم تھی اور چھٹیوں پہ گھر آئی ہوئی تھی۔

"ہاں اب تو یونی ورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ بی ایس آنرز کررہی ہے۔" رنم کا ذکر کرتے ہوئے احمد سیال کے لہجے میں خود بہ خود ہی فخر سا در آیا تھا، جیسے انہیں رنم کا باپ ہونے پہ غرور ہو۔

"میں اس وقت اسلام آباد میں ہوں۔ ایبک چیک اپ کروانے لایا ہے، سوچا تمہیں فون کرکے حال احوال پوچھ لوں۔"

"تم اسلام آباد میں ہو۔ میں آفس سے نکل رہا ہوں۔ سیدھے میرے گھر آؤ۔ مل بیٹھیں گے، اکٹھے لنچ کریں گے۔ پرانی یادیں تازہ کریں گے۔" احمد سیال فوراً" پرجوش ہوئے۔ ملک جہانگیر نے دو گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر فون بند کردیا۔

ایبک انہیں چیک اپ کروانے کے بعد گھر چھوڑ کر ابھی ابھی ضروری کام کا بول کر نکلا تھا۔ تب ہی تو ملک جہانگیر نے احمد سیال کو دو گھنٹے بعد کا ٹائم دیا۔ کافی دیر گزر چکی تھی، انہوں نے ایبک کو فون کرکے واپسی کا پوچھا۔ اس نے کہا ابھی مجھے ٹائم لگے گا۔ کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے ڈرائیور کے ساتھ احمد سیال کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

وہ گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔ "تم مجھے کچھ کمزور نظر آرہے ہو۔" احمد سیال انہیں تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جواباً" وہ مسکرائے۔

"دمے کی بیماری بھی لگ گئی ہے مجھے، دل کا مریض تو پہلے سے ہوں۔ ساتھ دیکھنے میں بھی دشواری پیش آنے لگی ہے۔ لیکن ان بیماریوں میں کیا رکھا ہے۔ میں آج بھی پہلے کی طرح باہمت اور حوصلہ مند ہوں۔" ملک جہانگیر شگفتگی سے مسکرائے تو احمد سیال نے تعریفی انداز میں ان کے شانے پہ تھپکی دی۔

"تمہاری ہمت اور حوصلہ قائم رہے جہانگیر۔" احمد سیال نے دل سے دعا دی۔ دونوں باتیں کرتے کرتے سیٹنگ روم میں آئے۔ آفس سے اٹھنے سے پہلے ہی گھر فون کرکے احمد سیال نے ملک جہانگیر کی آمد کا بتادیا تھا۔ یہ وجہ تھی جب وہ ڈائننگ ہال میں پہنچے تو ایک پرتکلف کھانا ان کا منتظر تھا۔

رنم ابھی تک یونی ورسٹی سے نہیں لوٹی تھی۔ احمد سیال کے ساتھ ساتھ ملک جہانگیر بھی اس کی آمد کے منتظر تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

گھر پہنچنے پہ کارپورچ میں اسے پاپا کی گاڑی نظر آئی، ساتھ ایک اجنبی گاڑی بھی تھی جو کم از کم اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ الجھ سی گئی، کیونکہ پاپا اس وقت شاذ و نادر ہی گھر میں پائے جاتے۔ چھٹی کا پورا دن وہ گھر گزارتے، ورنہ یہ امر محال تھا۔ گاڑی روک کر وہ نیچے اتری تو سامنے رمضان جاتا نظر آیا۔ رنم نے آواز دے کر روک لیا۔ وہ اس کے پاس مئودبانہ انداز میں کھڑا اس کے سوالوں کا جواب دینے لگا۔ "صاحب جی کے دوست آئے ہیں۔ وہ آپ کا دو، تین بار پوچھ چکے ہیں۔"

"اچھا جاؤ تم۔" وہ پرسوچ انداز میں چلتی اسی طرف آئی جس طرف رمضان نے مہمان کی موجودگی کی نشان دہی کی تھی۔ احمد سیال اور ملک جہانگیر اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ رنم کے سلام کرنے پہ چونکے اور متوجہ ہوئے۔ رنم اپنی بانہیں احمد سیال کے گلے میں حمائل کیے حال احوال پوچھ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا ان سے ملو یہ ہیں، میرے دوست ملک جہانگیر۔ بہت بڑے گاؤں کے مالک ہیں، لیکن روایتی چوہدریوں، زمین داروں سے بالکل مختلف ہیں۔" ایک ہلکی سی مسکراہٹ سمیت احمد سیال آنے والے مہمان کا تعارف کروا رہے تھے۔ رنم نے رسمی انداز میں ان کی خیریت دریافت کی۔ جواباً" انہوں نے خلوص سے "جیتی رہو" دعا دی۔

رنم اس کے بعد وہاں رکی نہیں، اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

رنم کے جانے کے بعد دونوں دوست پھر سے باتوں میں لگ گئے۔ ملک جہانگیر کو رنم بہت اچھی لگی تھی۔ جوان ہونے کے بعد اس نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ انہوں نے آج اسے کافی عرصے بعد دیکھا تو ذہن میں موجود سوچوں نے کچھ کچھ عملی صورت اختیار کرلی۔ ان کے چہرے پہ موجود خوشی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ملک جہانگیر نے گاؤں واپسی جانے کی تیاری کرلی

تھی۔ حالانکہ ابیک نے کتنا اصرار کیا کہ رات ادھر ہی رک جائیں، پر وہ نہیں مانے۔ گاؤں سے باہر وہ زیادہ دیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے لیے جائے پناہ ان کا گاؤں اور گھر تھا۔ وہ وہاں سچی خوشی اور سکون محسوس کرتے۔ "ملک محل" ان کے خوابوں کی جنت تھا۔ اس جنت کی شان بڑھانے کے لیے انہوں نے ملک ابیک اور ملک معاذ کے لیے، بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

ابیک تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سنبھال چکا تھا۔ جبکہ معاذ کی تعلیم مکمل ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ معاذ، ابیک کے مقابلے میں شوخ، لاپروا اور زندگی سے ہر پل خوشی کشید کرنے کا قائل تھا، یہ وجہ تھی کہ انہیں معاذ کے لیے رنم بالکل مناسب لگی تھی۔ ابھی تو وہ شادی کے نام سے دامن بچاتا تھا، مگر پورا یقین تھا رنم کو دیکھنے اور ملنے کے بعد وہ ان کی بات ٹالے گا نہیں۔

دوسری طرف وہ ملک ابیک کی بھی شادی کرنا چاہ رہے تھے۔ یہ بات بہت عرصے سے ان کے دل میں تھی۔ ابیک ان کا لاڈلا، فرماں بردار، سعادت مند بیٹا تھا۔ انہیں اس کے لیے ہیرا صفت لڑکی کی تلاش تھی، مگر ابھی تک وہ مل نہیں پائی تھی۔

اگر وہ معاذ یا ابیک کے لیے رنم کا رشتہ طلب کرتے تو احمد سیال نے انکار نہیں کرنا تھا۔ ان کی دوستی پرانی تھی۔ درمیان میں کچھ وقت ایسا بھی آیا جب ان کا رابطہ احمد سیال سے بالکل ختم ہو گیا، کیونکہ وہ اپنے کاروباری بکھیڑوں میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود ان کی دوستی اور گرمجوشی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ نہ یہ مصروفیت دلوں میں بسی محبت کم کر پائی تھی۔ اتنے عرصے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تو ملک جہانگیر کو مایوسی نہیں ہوئی۔ آج وہ بے پناہ خوش تھے۔

☆ ☆ ☆

زرینہ بیگم اور روبینہ دونوں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ زرینہ آدھا گھنٹہ پہلے ہی عجلت میں پہنچی تھیں، انہیں واپسی کی بھی جلدی تھی، کیونکہ امیر احمد کی طبیعت نارمل نہیں تھی، انہیں ہمہ وقت دیکھ بھال کی ضرورت پڑتی، وہ رابیل کو ضروری ہدایات دے کر گھر سے نکلی تھیں۔

"پھر کیا سوچا تم نے زرینہ؟" انہوں نے منہ قریب کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ "میں نے صرف سوچا نہیں ہے، عمل کرنے کی بھی ٹھان لی ہے۔ جتنا جلدی ہو سکتا ہے زیان کی شادی کرنی ہے.... ورنہ یہ فتنہ لڑکی میری آئندہ آنے والی زندگی میں بھی آگ لگا سکتی ہے۔" زرینہ کا لہجہ نفرت آمیز تھا۔

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ میرے وہاب کا حال نہیں دیکھا، ہر دو دن بعد تمہارے گھر پہنچا ہوتا ہے۔" روبینہ نے تائید کی۔

"مگر وہاب جیسے اس کی نگاہوں میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔"

"کیوں کیا ہے میرے وہاب کی حیثیت کو۔ اچھا کماتا ہے۔ شکل و صورت والا ہے، بھرپور مرد ہے۔" زرینہ کی بات پہ روبینہ تڑپ ہی تو گئیں۔ زرینہ نے ان کی جذباتی حالت دیکھ کر فوراً" اپنی بات کا تاثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

"میرا یہ مطلب نہیں آپا کہ خدانخواستہ وہاب یا آپ کم حیثیت ہیں۔ میں تو زیان کی بات کر رہی تھی کہ وہ بہت اونچی اڑان میں ہے۔

میری بلا سے جو بھی ہے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مگر وہاب کو ضرور پڑتا ہے اس کا دل زیان میں اٹک گیا ہے۔" زرینہ معنی خیز لہجے میں بولیں تو روبینہ نے اسے بے بسی سے دیکھا۔

"میں کیا کروں شروع میں سمجھ ہی نہیں پائی کہ تمہارے گھر کے اتنے چکر کیوں لگاتا ہے۔ مگر خیر! ابھی تک اس نے کھل کر اپنے منہ سے کچھ نہیں کہا ہے۔" روبینہ اب پرسکون تھیں۔

"آپا بہت جلد وہ اپنے منہ سے پھوٹے گا میں اس طوفان کو آپ کے گھر کی طرف بڑھتا دیکھ رہی ہوں۔"

"ہائے اللہ نہ کرے...." روبینہ نے دل پہ ہاتھ رکھ

لیا۔

"آپا فکر مت کریں، میں بہت جلد کوئی حل نکال لوں گی۔" زرینہ نے ان کی متغیر ہوئی رنگت دیکھ کر تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بلا ارادہ خالی الذہنی کے عالم میں مختلف ٹی وی چینل بدلے جا رہی تھی۔ کسی بھی جگہ وہ ذہن و نظر کو مرکوز نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے وہاب کے اندر کمرے میں آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ چند ثانیے بعد اسے کسی کی تیز نظروں کی تپش کا احساس ہوا تو وہ ریموٹ کنٹرول چھوڑ کر فوراً" سیدھی ہوئی۔ وہ اب پر شوق و پر تعیش نگاہوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

سفید دوپٹا جھٹک کر اس نے سر پہ لیا۔ "آنٹی، ابو کے کمرے میں ہیں وہاں تشریف لے جائیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح سرد مہر لہجے میں بولی۔ چہرے کے تاثرات میں خود بہ خود ہی لاتعلقی در آئی تھی۔ "ادھر سے ہی ہو کر آ رہا ہوں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا تو زیان اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ تشریف رکھیے میں بوا کو دیکھ کر آؤں کیا بنا رہی ہیں۔" اس نے بمشکل تمام لہجے کو مزید روکھا ہونے سے روکا۔ وہ جاتی زیان کی پشت کو بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے لمبے بالوں کی چٹیا دوپٹے سے نیچے تک نکلتی کمر کی طرف جاتی صاف دکھائی دے رہی تھی اس کے گلابی پیروں کی نرم و نازک ایڑھیاں مکمل طور پہ وہاب کی نگاہوں کی زد میں تھیں۔ وہ غصے و سرد مہری سے جا رہی تھی اور وہ اس کی ایک ایک ادا نقش حفظ کر رہا تھا۔ زیان سراپا غزل تھی اور یہ غزل پس منظر کے ساتھ بھی حسین تھی۔

"اف کیا کروں میں۔ اب تو لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گا۔" وہاب سر کے بال مٹھی میں جکڑتے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ سامنے ٹی وی اسکرین پہ مغنیہ درد بھرے لہجے میں نغمہ سرا تھی۔ "اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔"

وہاب کا دل دہل سا گیا۔ اس نے فوراً" چینل تبدیل کر دیا۔ "اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا۔ میں نے ہارنا نہیں سیکھا ہے۔ ہر قیمت پہ زیان کو حاصل کر کے رہوں گا' دیکھتا ہوں کون مجھ سے ٹکرانے کی ہمت کرتا ہے' تہس نہس کر دوں گا' زمین آسمان ایک کر دوں گا۔"

وہاب خیالوں کی رو میں تنہا بہت دور نکل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

زرینہ بیگم' امیر علی کے جسم کی فالج سے متاثر حصے کی مالش کر رہی تھی۔ جب سے انہیں فالج ہوا تھا' تب سے انہوں نے ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری خود سنبھال لی تھی۔ مالش کرنا وقت پہ دوا دینا ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مخصوص ورزشیں اور فزیو تھراپی وہ سب کچھ خود کرتیں بہت ہوا تو آفاق سے مدد لے لی' لیکن زیادہ کام خود سنبھالا ہوا تھا۔ وہ شوہر پرست عورت تھیں۔ اس خوبی کے امیر احمد بھی معترف تھے۔

مالش کرنے کے بعد انہوں نے زیتون کے تیل کی بوتل اپنی مخصوص جگہ پہ رکھی اور جا کر واش روم میں ہاتھ دھوئے۔ ہاتھ خشک کرنے کے بعد وہ دوبارہ ان کے پاس آ کر بیٹھ چکی تھیں۔ "اللہ آپ کو صحت دے آپ کا سایہ بچوں کے سر پہ سلامت رہے وقت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ زیان اور رابیل دونوں جوان ہیں' ان کے بعد آفاق اور مناہل ہیں۔ ہمیں اپنا فرض ادا کرتے کرتے بہت دیر لگ جائے گی۔" زرینہ بیگم نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا۔

یہ ایسا موضوع تھا کہ وہ اس پہ گھنٹوں بے تکان بحث کر سکتی تھیں۔ اس لیے امیر احمد نے انہیں ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ "میں نے اس دن آپ سے زیان کے بارے میں بات کی تھی' پھر کیا سوچا آپ نے؟" وہ کرید میں لگی تھیں۔

"میں نے کہا تو تھا ابھی وہ پڑھ رہی ہے' اتنی عمر تو نہیں ہے اس کی کہ فوراً" جلد بازی سے کام لیتے ہوئے

شادی کردوں۔" وہ اس دن کی طرح آج بھی اس بات پہ قائم تھے اور یہ ہی واحد بات زرینہ کو چبھی۔ یہ تو جیسے سینے کا ناسور بن گئی تھی۔

"آپ خود بیمار ہیں ذیان کے بعد ہماری اور بھی ذمہ داریاں ہیں۔ آپ خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہیں۔ میں ذیان کی دشمن نہیں ہوں جو اس کے لیے برا سوچوں گی۔"

زرینہ کی بات میں وزن تھا' پر امیر علی' ذیان کے مستقبل کے ارادوں سے آگاہ تھے۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو کر اس گھر سے فرار اختیار کرنا چاہتی تھی۔ اپنے اس ارادے کا اظہار اس نے کچھ سال پہلے واشگاف الفاظ میں کیا تھا۔ وقتاً" فوقتاً" وہ دہراتی اور اپنے عزم کو مضبوط کرتی' مگر پہلے اس کے ارادے میں گھر سے راہ فرار شامل نہیں تھا۔ اب تو اس کی آنکھوں اور لہجہ میں ہلکی ہلکی سرکشی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ امیر علی کرتے تو کیا کرتے۔ ذیان کی کالج کی تعلیم بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی' خود وہ معذور اور لاچار ہو کر بستر پہ تھے۔ اپنی بے بسی ولاچاری کا انہیں اچھی طرح ادراک تھا۔ تب ہی تو خاموش ہو جاتے۔ اس خاموشی پہ زرینہ کڑھتیں' انہیں یہ ایک آنکھ نہ بھاتی۔ ابھی بھی امیر علی نے آنکھیں بند کرلی تھیں جو ان کی طرف سے بات چیت ختم ہونے کا اظہار تھا۔

زرینہ غصہ دل میں دبائے باہر آئیں۔ بیرونی گیٹ لاک تھا۔ رحمت بوا بھی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ ذیان کے کمرے کا دروازہ بند تھا' لیکن بند دروازے کے نیچے سے روشنی کی ہلکی سی لکیر باہر آرہی تھی۔ کھڑکیوں پہ بھاری پردے پڑے تھے' کیونکہ موسم سرد تھا۔

وہ ٹھنڈی سانس بھرتی دوبارہ کمرے میں آئیں۔ باہر سکون تھا' لیکن ان کے دل میں امیر علی کی خاموشی سے ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پہلی تلخی اور پہلا دن باوجود کوشش کے آج بھی نہ بھول پائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کمرا سادے انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہ گھونگھٹ اوڑھے سر گھٹنوں پہ رکھے بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی نگاہیں اٹھ کر ادھر ادھر بھی دیکھ لیتی' مگر اس کی نگاہوں کا مرکز کمرے کا دروازہ تھا جہاں سے کسی کو گزر کر اس تک پہنچنا تھا۔ امیر علی کے بارے میں اس کی سہیلیوں' رشتہ داروں اور بڑی بہن روبینہ نے بہت کچھ بتایا تھا۔ وہ امیر اور صاحب جائیداد تھا۔ اس کے گھر نوکر کام کرتے دروازے پہ دو دو گاڑیاں کھڑی تھیں اور وہ خود بھی تو جاذب نظر شکل و صورت کا مالک تھا۔ زرینہ نے کسی نہ کسی طرح اس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی' جب وہ دعوت پہ ان کے گھر آیا۔ پھر سب سے تعریفیں سن سن کر اسے شادی سے پہلے ہی اپنی قسمت پہ رشک آنے لگا۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولا جھولتے وہ بھول گئی تھی کہ چاند میں داغ ہوتا ہے۔ امیر علی کے ساتھ بھی ایسا معاملہ تھا۔ وہ چڑھتے چاند کی مانند روشن اور مکمل تھا' مگر داغ کی صورت میں ایک بیٹی بھی ہمراہ تھی۔

ملنے جلنے والیوں اور خاص طور پہ روبینہ آپا نے اس کی بیٹی کے حوالے سے زرینہ کو مفید مشورے سے نوازا تھا جو اس نے گرہ میں باندھنے میں دیر نہیں لگائی۔ آگے بڑھتے قدموں کی آہٹ پہ زرینہ کی منتظر نگاہوں کو قرار سا آگیا۔ امیر علی اس کے قریب آکر بیٹھ چکے تھے۔

"تم پتا نہیں کیا کیا تصورات لے کر میرے گھر آئی ہوگی۔ تمہارے خوابوں میں کوئی شہزادہ بستا ہوگا۔ تم سوچتی ہوگی خوابوں کی حسین راہ گزر پہ میرا ہاتھ تھام کر محبوبہ کی طرح چلتی رہو اور میں عاشق بن کر تمام عمر تمہارے وجود کا طواف کرتا رہوں' معذرت چاہوں گا میں تمہاری سوچوں پہ پورا نہیں اتر پاؤں گا۔" ان کی عجیب دل دکھانے والی باتیں سن کر زرینہ سر اٹھا کر آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہوگئی۔ اس کی نگاہوں میں حیا سے زیادہ سوال مچل رہے تھے۔

"میں عورت کی بے وفائی اور مکاری کا ڈسا ہوا ہوں۔" امیر علی کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔ اس

وقت زرینہ نے جاتی عقل کے آخری سرے تھامنے چاہے۔

"میں سب جانتی ہوں اور مجھے اس کا بہت دکھ بھی ہے۔" اس نے شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے امیر احمد کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ تسلی دینے والے انداز میں رکھا۔ تو انہوں نے جذباتی سہارا میسر آتے ہی کمزور مرد کی طرح بکھرنا شروع کر دیا۔

"میں نے اپنی بیٹی اس... گالی... عورت سے چھین کر ہمیشہ تڑپتے رہنے کی سزا دی ہے۔ ساری عمر سسک سسک کر روئے گی' تم نے میری بیٹی کو ماں کا پیار دینا ہے' کل وہ یہاں آجائے گی اپنے گھر آج بوا رحمت کے پاس ہے۔ وہ اسے میری رشتے کی ایک پھوپھی کے گھر لے گئی ہیں بہت رو رہی تھی۔ میں اس کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ وہ ہماری بیٹی پہلے ہے اور تم میری بیوی بعد میں ہو۔"

ملن کی اولین ساعتوں میں ایسے کڑوے نصیحت بھرے جملے سن کر زرینہ کے سارے کومل جذبوں پہ اوس آگری۔ وہ امیر علی سے ایک لفظ تک نہ کہہ پائی۔

وہ پہلی بیوی کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہے ان کی ساری باتوں سے زرینہ نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی پہلی بیوی کردار و سیرت کے لحاظ سے اچھی عورت نہیں تھی اور اس نے شوہر کو بے وفائی کا گہرا گھاؤ لگایا ہے۔ زرینہ نے اسے دیکھا نہیں تھا' مگر اوروں کی زبانی سن رکھا تھا کہ زیان کی ماں خاصی حسین عورت ہے۔

دونوں ہاتھوں پہ گہری مہندی رچائے بھڑکیلا سوٹ پہنے خوشبوؤں میں بسی زرینہ' زیان کے استقبال کے لیے تیار تھی۔ ایک رات کی دلہن کو امیر علی نے بیٹی کے بارے میں ڈھیروں کے حساب سے نصیحتیں اور ہدایات دی تھیں۔ بالآخر زیان' بوا رحمت کے ساتھ آن وارد ہوئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے ریڈی میڈ فراک میں ملبوس گلابی گلابی گالوں والی زیان پہلی نظر میں ہی دل موہ لینے والی بچی ثابت ہوئی۔ مگر زرینہ کو دل ہی دل میں اس کی من موہنی شکل و صورت سے حسد محسوس ہوا۔ جب بیٹی اتنی حسین تھی تو اس کی ماں کی شکل و صورت کا اندازہ لگانا بالکل مشکل نہیں تھا۔

اس نے زیان کو گود میں لے کر پیار کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس کے بازو ہٹا کر بھاگ گئی۔ لگتا تھا اس نے زرینہ کی اپنے گھر میں آمد کو پسند نہیں کیا تھا۔ کیونکہ پہلے دن ہی اس نے امیر علی سے کہا کہ نئی مما اچھی نہیں ہیں' مجھے اپنی مما چاہیے۔ اس نے ضد شروع کر دی۔ امیر علی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پھول جیسے گال پہ ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ بے یقینی کی حالت میں گرفتار زیان کے بہتے آنسوؤں نے زرینہ کے جلتے بلتے دل کو عجیب سا سکون دیا۔ اسے ایک ثانیے کے لیے محسوس ہوا امیر علی کے گھر میں اس کی حیثیت اتنی بھی کمزور نہیں ہے' وہ چاہے تو آنے والے دنوں میں اپنا مقام خود متعین کر سکتی ہے۔ اس نے اپنے داؤ آزمانے شروع کر دیے۔

☆ ☆ ☆

چار سالہ زیان حال میں ہی اسکول جانا شروع ہوئی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے وہ بوا رحمت کو ذرا تنگ نہ کرتی' وہ اس کے گھنے بالوں کی پونیاں بناتی تو وہ شرافت سے ان کے سامنے بیٹھی رہتی' آرام سے شوز پہن لیتی' ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے اسکول اور ٹیچرز سے اسے دلچسپی پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ کیونکہ اسکول سے واپسی پہ وہ بیگ کھول کر اپنی سب کتابیں پھیلا کر بیٹھ جاتی اور کلرز پنسل سے طبع آزمائی شروع کر دیتی۔ ایسے میں وہ بہت مصروف اور خوش نظر آتی۔ آج بھی وہ ٹی وی لاؤنج میں اپنا اسکول بیگ کھول کر بیٹھی ہوئی تھی۔

زرینہ سامنے صوفے پہ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا' مگر زرینہ کی ساری توجہ زیان کی طرف تھی۔ اس کی نگاہ زیان کے ہاتھوں پہ ٹکی تھی جو برق رفتاری سے ایک خاکے میں رنگ بھرنے میں مصروف تھی۔

"زیان..." اس نے آہستہ آواز میں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سوالیہ نگاہیں زرینہ کی طرف کیں' مگر منہ سے نہیں بولی۔

"سنو، تمہاری مما کیسی تھی؟" اس کے لہجے میں موجود تجسس بچی سمجھ نہیں پائی۔

"میری مما بہت اچھی ہیں۔"

"کتنی اچھی ہیں؟ جانے اسے کس چیز کی جستجو تھی۔"

"آپ سے اچھی ہیں، آپ مجھے پسند نہیں ہیں۔"

وہ ایک دم سے سن ہوتی چھوٹی سی بچی میں کوئی مصنوعی پن نہ تھا۔ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں سچ بولا تھا۔ چند ثانیے بعد اس کے سن پڑتے وجود میں غیض و غضب کا طوفان اٹھا۔ اس نے لپک کر ذیان کے بال مٹھی میں جکڑے۔ بوا رحمت اپنے کوارٹر میں آرام کر رہی تھیں، جبکہ امیر علی آفس میں تھے۔

"کسی حرافہ کی اولاد تو بھی مجھے پسند نہیں ہے۔"

ذیان کی آواز مارے خوف کے بند ہو گئی۔ وہ پھٹی پھٹی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی "اور خبردار کسی کو یہ بات بتائی، ورنہ چھری سے گلا کاٹ دوں گی۔" اس نے سچ مچ فروٹ نائف جانے کہاں سے اٹھا کر اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائی تو ذیان کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اس کے لب خاموش اور آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری تھیں۔

زرینہ کے دل کو حیوانی تسکین کا احساس ہوا۔ ابھی شطرنج کے سب مہرے اس کے پاس تھے۔ اسے دل ہارنے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا اندھیرا اور فسوں ہر شے کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ زرینہ سب کاموں سے فارغ ہو کر امیر علی کے برابر لیٹ چکی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ان کے سینے پہ دھرا تھا اور رخ بھی ان کی طرف تھا۔

"مجھے آپ کی اور اس گھر کی بہت فکر رہتی ہے۔" وہ سینے سے ہاتھ اٹھا کر اب ان کے سر میں ہلکے ہلکے کنگھی کرنے والے انداز میں پھیر رہی تھی۔

"میں اس گھر اور مکینوں کے بارے میں تمہارے جذبات سے آگاہ ہوں۔" امیر علی کا لہجہ سکون سے بھرا تھا، کچھ زرینہ کی انگلیوں کا جادو تھا، ان کے روم روم میں سکون کی پھوار برسنے لگی۔

"لیکن یہ بات مجھے اندر ہی اندر کاٹ رہی ہے۔" ان کے سر کے بالوں میں رینگتی انگلیاں ایک جگہ رک سی گئی۔ امیر علی نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا جہاں کالی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ "کون سی بات بتاؤ" وہ یک دم اپنی جگہ سے اٹھ گئے، دل کسی انہونی کے خدشے سے لرز رہا تھا۔ وہ متوحش سے ہو گئے۔

"میں اس گھر سے اس کی ایک ایک اینٹ سے محبت کرنے لگی ہوں۔" وہ اب باقاعدہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"پلیز بتاؤ زری کیا بات ہے، میرا دل ہول رہا ہے۔" انہوں نے روتی زرینہ کو ساتھ لگا لیا۔

"ذیان سے میں بہت پیار کرتی ہوں، مگر جانے کیا بات ہے۔ وہ میری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ کہتی ہے اس کی مما بہت اچھی ہے میں اسے پسند نہیں ہوں۔" اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کے شغل میں مصروف تھی۔ اس کی بات سنتے ہی امیر علی کے سب اعصاب تن سے گئے۔

"وہ بچی ہے، تم اس کی باتوں کو دل پہ مت لو۔" وہ رسان سے بولے، مگر دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی کہ ذیان نئی ماں کا موازنہ اس قابل نفرت عورت سے کرنے لگی ہے۔

"وہ کہتی ہے میری مما پری جیسی ہے۔ آپ ذرا بھی اچھی نہیں۔" زرینہ نے امیر علی کے چہرے پہ پھیلتی طیش کی سرخی دیکھ لی، جذباتی ہتھیار اس کے پاس تھا، کوئی وار بھی خالی نہیں جا رہا تھا۔

"وہ اپنی ماں کو ابھی تک نہیں بھولی ہے۔ میری محبت نے ذیان پہ کوئی اثر نہیں کیا، جانے اس چلتر عورت کے پاس کیا جادو تھا۔"

"ذیان کے دماغ کو اس عورت کے نام اور تصور تک سے پاک کر دو۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے، اس کے لیے سختی سے بھی کام لینا پڑے تو لو، میں تم سے

پوچھوں گا نہیں۔" اپنی اس کامیابی پہ زرینہ خوشی سے پھولے نہیں سما پا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رابیل کی پیدائش پہ زیان چھ سال کی تھی' اس کا شعور آہستہ آہستہ پختگی کی نامعلوم منازل طے کر رہا تھا۔ زرینہ کے ساتھ اس کے تعلقات کسی بھی قسم کی گرمجوشی سے عاری تھے۔ لیکن اس کے چھوٹے سے ذہن میں یہ حقیقت پورے طور راسخ ہو چکی تھی کہ زرینہ آنٹی بہت طاقت ور ہیں' ان کے سامنے ناپسندیدگی احتجاج اسے بہت مہنگا پڑا تھا۔ مگر یہاں بابا بھی تو اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اپنی دوسری بیگم کے کسی بھی ناروا سلوک پہ بھی انہیں کچھ نہیں کہا۔ وہ دن بھر بابا کی غیر موجودگی میں اس کی مما کے بارے میں گندی باتیں کرتیں' وہ باتیں اسے بالکل پسند نہیں تھیں' مگر اسے سننا پڑتیں۔ زرینہ آنٹی نے بہت کوشش کی کہ وہ انہیں مما کہہ کر مخاطب کیا کرے۔ پر یہاں اس نے ان کی نہیں چلنے دی تھی۔ وہ زرینہ آنٹی ہی بلاتی۔

بابا بھی ہمیشہ ان کی حمایت کرتے' جبکہ اسے اپنی مما کے حوالے سے زرینہ آنٹی کے منہ سے ایسی کوئی بھی بات سننا پسند نہیں تھی۔ اس نے تھری کلاس میں جب بابا کے سامنے زرینہ آنٹی کی شکایت کی تو جواباً" انہوں نے اسے زندگی میں دوسری بار تھپڑ مارا۔ اسے تھپڑ پڑتے دیکھ کر وہ خوش تھیں' ان کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ پہلے ہر بات پہ زیان احتجاج کرتی' روتی' مگر اس ذلت آمیز تھپڑ کے بعد اس کے آنسو ختم ہو گئے۔ اب زرینہ آنٹی سارا دن اس کی مما کا نام لے کر گندی اور عجیب باتیں کرتیں' مگر اس کے چہرے اور دل میں بے حسی طاری رہنے لگی۔ اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ ان کی زبان کی دھار تیز ہوتی گئی۔ اب تو رابیل بھی اس کی مما کے کرتوتوں سے آگاہ ہو چکی تھی۔ ایک دن اس نے زرینہ آنٹی کی طرح زیان کو اس کی مما کا نام لے کر طعنہ دیا' مگر اس بار اسے غصہ نہیں آیا۔ وہ پہلے کی طرح صرف خاموش ہو کر رہ گئی۔ وہ بابا کے چہرے پہ کچھ تلاشتی پر وہاں بھی خاموشی ہوتی۔

زرینہ ماں بننے کے بعد اور بھی طاقت ور اور منہ زور ہو گئی تھی۔ امیر علی کمزور پڑ گئے تھے۔ بہت کچھ سن کر بھی ان سنی کر دیتے' مگر زیان کا معاملہ کچھ اور ہی سمت میں چل پڑا تھا۔ وہ منہ سے اب بھی نہیں بولتی تھی' مگر خاموش سرد نگاہوں سے زرینہ آنٹی کو دیکھتی ضرور تھی۔ اپنی زندگی میں مگن امیر علی کو پلوں کے نیچے بہت سا پانی گزر جانے کا احساس تک نہ ہوا۔ زیان ان سے بہت دور جا چکی تھی۔ اب وہ چاہنے کے باوجود بھی اسے واپس نہیں لا سکتے تھے۔ درمیان میں وقت کے ظالم فاصلے حائل تھے۔ وہ اب تین' چار سالہ زیان نہیں رہی تھی۔ کالج کی طالبہ کے نوجوان لڑکی کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ رگوں میں رچی بسی تلخی نے اسے زہریلا بنا دیا تھا۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ بچپن میں انہوں نے زیان پہ توجہ نہیں دی۔ زرینہ سے شادی کر کے وہ اس کی طرف سے بے فکر تھے۔ وہ قطعی طور پہ لاعلم تھے کہ زرینہ نے زیان کے معصوم بچپن کو زہر آلود کر دیا ہے۔

انہوں نے خود ہی تو زرینہ بیگم کو سب بتایا تھا۔ اپنی نفرت' کھولن کڑواہٹ سب کے سب راز خود اپنے ہاتھوں زرینہ کو پیش کیے۔ اس نے وہ سب ہتھیار بے دریغ زیان پہ استعمال کیے۔ شروع میں ہی زرینہ نے اعتماد کے غبارے میں جو ہوا بھری وہ بہت بعد میں جا کر نکلی۔ انہوں نے جیتے جی صحت مندی' خوش حالی کے زمانے میں ہر چیز کا مالک زرینہ کو بنا دیا۔ گھر' کاروبار' جائیداد سب کچھ ان ہی کے تو نام تھا۔ وہ اب کس برتے پہ اکڑتے۔ خاموش ہو کر رہ گئے تھے۔

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی زیان اور وہ سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اپنی سوکن کی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہی گھر میں چلتے پھرتے دیکھنا زرینہ کے لیے اذیت ناک تجربہ تھا۔ اتنے برس

انہوں نے برداشت کیا تھا' اب ہمت جواب دے گئی تھی۔ امیر علی کی پہلی بیوی اور بیوی بھی ایسی جیسے وہ خود بھی شدید نفرت کرتے تھے اور زرینہ' امیر علی سے بھی زیادہ زیان سے نفرت کرتی تھیں۔

رابیل' آفاق اور مناہل کو انہوں نے زیان کے قریب ہونے ہی نہیں دیا تھا۔ اپنی نفرت انہوں نے تربیت کے ذریعے اولاد میں بھی کافی حد تک منتقل کردی تھی۔

اس گھر میں بوا رحمت واحد ایسی ہستی تھیں جن سے زیان کا قلبی و جذباتی تعلق تھا۔ وہ ایک طرح سے ان کے ہاتھوں میں ہی پلی بڑھی تھی۔ یہ بوا ہی تھیں جو وہ زرینہ آنٹی کی نفرت سہ گئی تھی۔ وگرنہ پاگل ہو کر غلط راستوں کی مسافر بن جاتی۔ بوا آڑے وقتوں کا سہارا اور اس کی ڈھال تھیں۔ بہت زمانے سے یہاں اس گھر میں تھیں۔ اس لیے امیر علی ان کا بہت احترام کرتے اور ان کی بات کو اہمیت بھی دیتے۔ بوا نے بہت ہی خاموشی سے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اپنے غیر جانبدار کردار کو عرصے تک نبھایا اور اب تک نبھاتی چلی آرہی تھیں۔

گھر کا ہر فرد ان کی عزت کرتا۔ زیان کے لیے بوا کا دم غنیمت تھا۔ وہ اس کی ماں' باپ' دوست' استاد سب کچھ ہی تو تھیں۔ یہ بوا ہی تھیں جن کی بدولت وہ زمین پہ چل پھر رہی تھی' نہ صرف چل پھر رہی تھی' بلکہ اپنے پسندیدہ کالج میں پڑھ بھی رہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ شکوے کرنا چھوڑ دیے تھے۔ شاید وہ تقدیر پہ راضی و برضا تھی' پر اس خاموشی میں کتنے طوفان چھپے تھے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا۔ اب زرینہ بیگم جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں۔ پر امیر علی کمزور حیثیت میں ہی سہی پر ان کے آڑے آرہے تھے کہ پہلے زیان کو تعلیم مکمل کرنے دو' پھر سوچا جائے گا۔

وہاب کچھ عرصے سے بلاناغہ ان کے گھر کے چکر کاٹ رہا تھا۔ ایسے میں زیان جتنی جلدی اپنے گھر کی ہوتی تب ان کے دل کی پھانس بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتی۔

✡ ✡ ✡

عنیزہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی خود کو آئینے میں بغور تکتی چہرے پہ نائٹ کریم کا مساج کر رہی تھیں۔ ملک ارسلان جہازی سائز بیڈ پہ نیم دراز ان کی اس سرگرمی کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے انداز میں بچوں کی سی معصومیت اور اشتیاق تھا۔ شادی کے اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی عنیزہ کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ حسن و رعنائی کا چھلکتا جام تھا۔ ملک ارسلان سیراب ہی نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تشنگی روز اول کی طرح قائم و دائم تھی۔ وہ آج بھی نوعمر عاشق کی طرح عنیزہ کے حسن کے گرویدہ تھے۔

کبھی کبھی تو وہ اس بے تابی و وارفتگی پہ جھنجلا سی جاتیں۔ ارسلان نے انہیں بے پناہ محبت دی تھی۔ کبھی کبھی خیال آتا ارسلان کے پاس محبت کے معاملے میں قارون کا خزانہ ہے۔ جو دونوں ہاتھوں سے دیوانہ وار لٹانے کے بعد بھی ختم یا کم نہیں ہو رہا تھا۔ عنیزہ فارغ ہو کر بیڈ پہ آئیں۔ ارسلان انہیں توجہ و شوق سے تکتے ادھر ادھر کی عام باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ انہوں نے ان کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ ان کی آنکھیں لبالب نمکین پانیوں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ ان کے لبوں سے ایک سسکی تک نہ نکلنے پائے' ورنہ ملک ارسلان بہت ہرٹ ہوتے۔ انہوں نے بہت پہلے عنیزہ سے ایک وعدہ لیا تھا کہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔ ان کے سامنے وہ نہیں روتی تھیں۔ لیکن تنہائیوں میں آنکھیں گھٹا کی طرح برستیں۔ ان کے لبوں پہ صحراؤں کی سی پیاس تھی اور اس پیاس سے سیراب ہونے کی کوئی تدبیر انہیں پتا نہیں تھی۔

بہت دیر بے آواز رونے کے بعد دل کو کچھ سکون ہوا۔ انہوں نے کندھے کے بل اٹھ کر تھوڑا پانی پیا نیم اندھیرے میں انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوئے

ہوئے ارسلان ملک کو دیکھنے کی ناکام سی کوشش کی اور پھر دوبارہ لیٹ گئیں۔

ارسلان بے سدھ سکون کی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ عنیزہ کو ان کی نیند پہ رشک سا ہوا اور خود پہ ترس بھی آیا۔ ایک وہی محروم اور تشنہ تھیں۔ ارسلان کتنے سکون میں تھے۔ سب کچھ پالیا تھا اور ایک وہ تھیں سب کچھ پاکر بھی خالی ہاتھ تھیں۔ ارسلان ان کے مجازی خدا نے تو محرومی سے سمجھوتہ کرلیا تھا' پھر وہ نہیں کرپائی تھیں۔

کتنی بار تنہائی میں انہوں نے ایک ننھے منے وجود کو خود سے لپٹے محسوس کیا تھا۔ اس کے رونے کی آواز سنی تھی۔ لیکن ایسا صرف چند ثانیے کے لیے ہوتا۔ حقیقت بڑی تلخ اور سفاک تھی۔ ان کی گود خالی بنجر تھی اور ملک ارسلان کا کوئی نام لیوا نہیں تھا۔ ملک جہانگیر دو کڑیل جوان بیٹوں کے باپ تھے۔ وہ ان کے وارث فخر اور مان تھے۔ افشاں بیگم کے لہجہ میں دونوں بیٹوں کے نام پہ کیسی مٹھاس اتر آتی۔ ان کا سر اونچا ہوتا جیسے دونوں جہاں ان کے قدموں تلے ہوں۔

ملک ارسلان کو بھی محرومی ستاتی۔ مگر کم از کم عنیزہ کے سامنے انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہوچکا تھا۔ عنیزہ اکیلی روتی سسکتی پر ملک ارسلان کے سامنے ان کے لبوں پہ چپ کا قفل تھا۔

✡ ✡ ✡

راعنہ نے کچھ دیر پہلے ہی فون پہ یہ ناقابل یقین خبر سنائی تھی۔ ان سب کو تو ناقابل یقین ہی لگی تھی۔ کیونکہ راعنہ نے تو کبھی اشارتاً" بھی یہ ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کزن شہریار سے منسوب تھی۔ وہ تعلیم مکمل کرکے عملی میدان میں آچکا تھا۔ اب اس کے والدین راعنہ کو بہو بنا کر اپنے خواب پورے کرنا چاہ رہے تھے۔ کیونکہ راعنہ کے ماموں یعنی شہریار کے والد کافی عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ان کی بیماری سنگین نوعیت کی تھی۔ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ اپنی زندگی میں ہی بیٹے کو دولہا کے روپ میں دیکھنا چاہ رہے تھے۔ راعنہ کے ڈیڈی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر ابھی اس کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ چھٹا سمسٹر شروع تھا۔ بی ایس آنرز کا۔ دو دن سے راعنہ یونی ورسٹی بھی نہیں آرہی تھی۔ جبکہ ایگزام بھی قریب تھے۔ ایسے میں اس کی یونی ورسٹی سے غیر حاضری حیران کن اور نہ سمجھ میں آنے والی تھی۔ رنم اور کومل ابھی یونی ورسٹی میں ہی تھی جب باری باری راعنہ نے دونوں کو الگ الگ کال کرکے اپنی اچانک طے ہوجانے والی شادی کی اطلاع دی۔

کومل نے فراز اور اشعر کو ڈھونڈ کر پھولے پھولے سانسوں سمیت یہ بریکنگ نیوز سنائی۔ رنم نے باقی کی کلاسز چھوڑدیں اور سیدھی پارکنگ ایریا میں جاکر اپنی گاڑی نکالی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی کومل اشعر اور فراز تھے۔ افتاں و خیزاں وہ راعنہ کے گھر پہنچے۔

راعنہ مزے سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ رنم اور کومل کا خیال تھا۔ وہ اٹوانی کھٹوانی لیے پڑی رہی ہوگی۔ اچھا خاصا فلمی سین ہوگا۔ جنگ ہورہی ہوگی کہ ابھی میں شادی نہیں کرسکتی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کہتی کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی شادی کروں گی۔ مما' پاپا بے شک کہتے رہیں' مگر میں وہی کروں گی جو سوچا ہے' کیونکہ ماموں کی خرابی صحت اور ان کی خواہش شہریار کو دولہا بنے دیکھنا اس کے علم میں تھی اور اب وہ مزے سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ خاص طور پہ کومل اس کا تو چہرہ ہی اتر گیا۔ راعنہ سب سے نارمل ملی اور اپنے گھریلو ملازم کو آواز دی۔ کیونکہ اسے پتا تھا وہ سب دوست یونی ورسٹی سے سیدھا اسی کے گھر آئیں گے اور پیٹ پوجا تو لازمی کریں گے۔ ان کی زبردست سی خاطر مدارات کا انتظام سب کچھ ریڈی تھا۔

وہ ملازم کو کھانا لگانے کا بول کر آئی تو سب دوستوں کو اپنی طرف گھورتے پایا۔ "کیا سن رہے ہیں ہم؟" رنم نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورا تو راعنہ نے ڈرنے کی کامیاب اداکاری کی۔

"جی کیا سنا ہے آپ نے؟"

"یہی کہ آپ محترمہ کی شادی اچانک طے پا گئی ہے' ٹھیک پچاس منٹ پہلے میرے سیل فون پہ کال آئی تھی۔" رنم نے اپنی ریسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے وقت کا اندازہ لگایا جو بالکل درست تھا۔

"جی آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔" راعنہ اسی کے انداز میں سعادت مندی سے بولی۔

"ارے خوب مزا آئے گا۔" اشعر نے صوفے سے کھڑے ہو کر دونوں بازو فضا میں لہرائے۔ راعنہ نے رونی سی صورت بنالی جو اس کے دکھائی دینے والے تاثرات کے ساتھ ذرا بھی میل نہیں کھا رہی تھی۔

"تم اسب فرینڈز کو میرے بچھڑنے کا دکھ نہیں ہے؟"

"تمہیں دکھ نہیں ہے تو ہمیں کیوں ہو گا۔ ہم تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ تم بیٹھی رو رہی ہو گی۔ مگر یہاں تو چہرے پہ گلاب کھلے ہوئے ہیں ذرا بھی افسوس نہیں ہے تمہیں۔" کومل نے ناک کر وار کیا۔ ذرا سی دیر میں ہی صوفے کے سب کشن ان چاروں کے ہاتھوں میں تھے اور راعنہ پورے کمرے میں اپنے بچاؤ کے لیے بھاگتی پھر رہی تھی۔ کوئی بھی معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اچھی طرح درگت بنانے کے بعد اس کی جان بخشی کی گئی۔ اس کے بعد شرافت سے ساری کہانی سنی گئی۔

"اصل میں ماموں بیمار ہیں' ان کی حالت پچھلے دنوں سیریس ہو گئی تھی' تب ممانی نے پاپا سے بات کی کہ شہریار اور راعنہ کی شادی کر دینی چاہیے' سو انہوں نے ہاں کر دی۔ میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ شہریار نے شادی کے بعد مجھے اپنا بی ایس آنرز مکمل کرنے کی اجازت دے دی ہے۔" وہ آرام سے پوری کہانی سنا چکی تو کومل لٹکے منہ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم شادی کی وجہ سے خوش ہو۔"

"ارے میں شادی کی وجہ سے بھی تو خوش ہوں۔" راعنہ تیزی سے بولی جیسے اسے یہ ڈر ہو کہ کومل کوئی اور مطلب نہ نکال لے۔ اس پہ رنم اور کومل کی کھی کھی شروع ہو گئی۔

"دیکھ لو کیا زمانہ آ گیا ہے لڑکی اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ میں شادی کی وجہ سے بھی تو خوش ہوں۔ ایک مشرقی لڑکی ہوتے ہوئے بھی ایسی بولڈنیس۔" کومل اور رنم دونوں اسے چھیڑ رہی تھیں' مگر اب وہ بھی ان کے ساتھ ہنس رہی تھی۔

فراز اور اشعر نے بزرگانہ انداز میں دعا دی۔ "سدا خوش رہو اور دودھ میں نہاؤ۔" دودھ میں نہانے کی دعا فراز نے اپنی عقل کے مطابق دی تھی' کیونکہ اسے محاورے نہیں آتے تھے۔ زبردست سا لنچ کرنے کے بعد فراز اور اشعر واپس اپنے گھر چلے گئے۔ جبکہ کومل اور رنم دونوں راعنہ کے پاس ہی تھیں۔

شادی ایگزام کے بعد تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ مل کر اپنا پروگرام بنا رہی تھی۔ "میں چاہتی ہوں کہ ایگزام کے بعد ہی شاپنگ کروں۔ تم دونوں نے میرا ساتھ دینا ہے۔ میری کوئی بہن تو ہے نہیں تم لوگوں نے ہی سب کچھ کرنا ہے۔"

"ہاں تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو ہم ہیں نا' کیوں رنم۔" کومل نے رنم سے تائید چاہی۔ وہ خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ کومل کی بات پہ فوراً "ہاں" میں سر ہلایا۔

"میں تو راعنہ کی شادی پہ پیارے پیارے ڈریسز بنواؤں گی۔" کومل کو اپنی پڑی تھی۔ رنم ہنسنے لگی' کومل ہر بات میں' ہر کام میں عجلت سے کام لیتی تھی۔ اسے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ سب کام سکون اور آرام سے کرنے کی عادی تھی۔ "رنم تم میری شادی پہ کیا پہنو گی؟" راعنہ نے پوچھا۔

"ابھی کچھ ڈیسائیڈ نہیں کیا ہے میں نے۔"

"میں تو یہ خوب کام والے ڈریس بنواؤں گی' ایک دم ایسٹرن لک۔" کومل پھر شروع تھی۔ جبکہ اب رنم گھر واپسی کا سوچ رہی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ آج پاپا نے گھر جلدی آنے کا کہا تھا۔ راعنہ سے اجازت لے کر وہ واپسی کے لیے نکل آئی۔ جبکہ کومل ابھی تک

راعنہ کے کان کھارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شان دار سے سجے سجائے سیٹنگ ایریا میں ملک جہانگیر' ملک ارسلان' عنیزہ' افشاں بیگم چاروں موجود تھے۔ ادھر ادھر کی عام باتیں ہو رہی تھیں' جبکہ ملک جہانگیر نے احمد سیال کا ذکر چھیڑ کر ان سب کو وہاں جانے کا بتایا۔ ملک جہانگیر کا انداز بہت خاص تھا' جیسے وہ کوئی بہت ضروری بات بتانا چاہ رہے ہوں۔

"میں چیک اپ کروانے کے بعد ڈرائیور کے ساتھ احمد سیال کے گھر چلا گیا۔ وہاں میں نے کھانا کھایا اور اس کی بیٹی سے بھی ملاقات کی۔" افشاں بیگم اور عنیزہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ملک جہانگیر اتنا بولنے کے بعد خاموش ہو گئے جیسے ذہن میں کچھ خاص جملے سوچ رہے ہوں۔

"میں معاذ اور ابیک کی شادی کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ معاذ کے لیے مجھے احمد سیال کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔"

"تو ابیک کے لیے کیا سوچا آپ نے وہ معاذ سے بڑا ہے۔" افشاں بیگم ان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولیں تو ملک جہانگیر ہنس دیے۔

"معاذ کے لیے تو میں نے لڑکی پسند کر لی ہے' اب مسئلہ ابیک کا ہے تو اس کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے۔ ہم اپنی حیثیت کے مطابق اچھے خاندان سے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی لائیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ملک ارسلان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ "معاذ کے لیے آپ نے لڑکی پسند کر لی ہے' کیا اس کی بھی رائے لی ہے۔" ملک ارسلان نے سوال کیا تو ایک ثانیے کے لیے وہ چپ سے ہو گئے۔

"تم' عنیزہ میں' ہم سب احمد سیال کے گھر چلیں گے تم وہاں اس کی بیٹی دیکھ لینا' اگر کسی فیصلے پہ پہنچے تو میں تب معاذ کو بتاؤں گا۔"

"اس کی سرپھری طبیعت کا آپ کو پتا ہے نا۔ خود اسے لڑکی پسند کرنے دیں' ورنہ وہ شور مچائے گا۔" افشاں بیگم نے یہ پہلو بھی ان کے سامنے رکھا۔

"بھائی جان آپ ایسا کریں کہ چھٹیوں میں معاذ کو پاکستان بلوائیں' پھر اسے بھی لڑکی کے گھر لے جا کر ایک نظر دکھا دیں۔ اسے پسند آ گئی تو رشتہ مانگ لیں گے ہم۔" عنیزہ نے اپنے تئیں اچھا مشورہ دیا۔

"ہاں میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ معاذ چھٹیوں پہ گھر آئے تو اسے احمد سیال کے گھر لے جاؤں۔ اس کی بیٹی بھی پڑھی لکھی ہے معاذ ناپسند نہیں کرے گا۔" ملک جہانگیر نے عنیزہ کی تائید کی تو ایک پرسکون مسکراہٹ ان کے لبوں پہ پھیل گئی۔

"میرے ابیک کے لیے بھی رشتہ دیکھیں ملک صاحب۔" افشاں بیگم کے لہجے میں ممتا کی گرمی اور شفقت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"ہاں وہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ دونوں کی شادی ایک ساتھ کروں گا۔" ملک جہانگیر مسکرائے۔

"ابھی معاذ کی تعلیم مکمل ہونے میں پورا ایک سال باقی ہے' تب تک ابیک کنوارہ رہے گا؟" افشاں بیگم نے بڑے ناراض انداز میں سوال کیا تھا۔

انہیں یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ معاذ کے لیے تو لڑکی پسند کر لی گئی تھی اور ابیک کے لیے وہ ابھی تک کسی کے گھر رشتہ مانگنے تک نہیں گئے تھے۔ انہیں اپنے شریک حیات سے شکوہ سا تھا۔ لیکن وہ بیٹے کے باپ ہونے کی حیثیت سے اس کی طرف سے ہرگز لاپروا نہیں تھے۔ ابیک' معاذ کے مقابلے میں سنجیدہ' باشعور خیال کرنے والا اور اپنی ذمہ داری نبھانے والا حساس بیٹا تھا۔ وہ اس کے لیے گونا گوں خوبیوں والی ہمہ صفت بہو ڈھونڈ رہے تھے' پر ابھی تک گوہر مقصود ان کی نظر میں آیا نہیں تھا' ورنہ یہ کیسے ممکن تھا' وہ اسے چھوڑ کر معاذ کے لیے پہلے احمد سیال کے گھر رشتہ مانگنے جاتے۔

"ابیک کے لیے بھی میں اچھا ہی سوچ رہا ہوں۔ تم اور عنیزہ اس کے لیے رشتے دیکھو۔ عورتیں تو ایسے کاموں میں بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔" ملک جہانگیر نے

قصداً" ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا تو افشاں بیگم کے لبوں پہ پہلی بار پرسکون مسکراہٹ آئی۔ عنیزہ نے ان کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔
"بھائی جان ابیک گاؤں آئے تو اس سے بھی ڈسکس کر لیجیے گا۔" ملک ارسلان بولے۔ "ہاں میں اس کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔" ملک جہانگیر دل ہی دل میں کچھ سوچ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

ابیک گاؤں واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔ بابا جان نے اسے بلوایا تھا۔ وہ اسے طرح کبھی واپس نہیں بلواتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی سوچوں سے الجھتا گاؤں واپس جا رہا تھا۔
اس کی سلور مرسڈیز سیلون جب حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ سب اسے گرمجوشی اور نارمل انداز میں ملے۔ کسی کے چہرے سے بھی کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے خود سے پوچھنا مناسب سمجھا بھی نہیں۔ ہاں رات کو جب وہ بابا جان کے پاس بیٹھا فرصت سے باتیں کر رہا تھا' تب یہ عقدہ حل ہوا کہ بابا نے اسے کیوں بلوایا ہے۔
وہ ان کی بات سن کر ایک ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا۔ ملک جہانگیر اس کی خاموشی سے بے نیاز اپنی باتیں کر رہے تھے۔ "میں چاہتا ہوں تمہاری اور معاذ کی شادی ایک ساتھ کروں یا پھر دونوں میں سے پہلے تمہاری' میں اسے بھی بات کروں گا' تعلیم تو اس کی ویسے بھی مکمل ہونے والی ہے۔ مگر تم بڑے بیٹے ہو شادی کا پہلا حق تمہارا ہے۔ معاذ کے لیے میں نے اپنے دوست احمد سیال کی بیٹی دیکھ رکھی ہے۔ تمہاری اگر کوئی خاص پسند ہے تو بتاؤ۔ تمہاری مرضی اور پسند کا پورا خیال رکھا جائے گا۔" ملک جہانگیر بہت نرمی اور شفقت سے بول رہے تھے۔ ساتھ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لے رہے تھے۔
"بابا جان فی الحال میری شادی اور رشتے کے فیصلے کو موخر کر دیں۔" ملک ابیک کا لہجہ مضبوط اور واضح تھا۔
"میں کون سا تمہاری چٹ منگنی پٹ بیاہ کی بات کر رہا ہوں۔ سال دو سال بعد شادی کی جا سکتی ہے۔ تم بڑے ہو' قدرتی طور پہ میرا اور تمہاری ماں کا دھیان اس طرف جاتا ہے۔"
"بابا جان میں ابھی بہت بزی ہوں۔ میرے کچھ پروجیکٹس ہیں۔ مجھے پہلے انہیں مکمل کرنا ہے۔"
"تم اپنے پروجیکٹس شادی کے بعد مکمل کرتے رہنا۔"
"بابا جان میں گاؤں میں ایک انڈسٹریل ہوم بنانا چاہتا ہوں' شہری طرز کا جدید سہولتوں سے آراستہ۔ میرے ذہن میں عورتوں کی فلاح و بہبود کے حوالے سے کچھ آئیڈیاز ہیں' کم از کم مجھے ان کی تکمیل کے لیے تو ٹائم دے دیں۔" اس کے انداز میں فرماں برداری تھی۔ ملک جہانگیر کو وقتی طور پہ تھوڑا سکون ہوا۔
دل ہی دل میں وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ اتنے میں ان کا سیل فون مدھر انداز میں دھن بکھیرنے لگا۔ "معاذ کالنگ" کے الفاظ سے موبائل فون کی اسکرین جگمگا رہی تھی۔ انہوں نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ کچھ دیر پہلے اس کے بارے میں بھی بات ہو رہی تھی۔ اب اس کی کال آئی تو ملک جہانگیر باغ باغ ہو گئے۔
"کیسے ہو معاذ پتر۔" وہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں بولے۔
"بابا جان میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ کی خیریت معلوم کرنی تھی۔" اس کی پرجوش آواز سیل فون سے باہر تک آ رہی تھی۔ ملک ابیک بخوبی سن رہا تھا۔
"بابا کی جان میں بالکل ٹھیک ہوں' یہ بتاؤ تم کب آ رہے ہو پاکستان؟"
"کیوں بابا جان؟" اس نے سوال کے جواب میں الٹا سوال کر دیا۔ "تمہاری چھٹیاں تو ہونے والی ہیں نا۔ تم آؤ تو تمہارے رشتے کی بات چلاؤں۔" ملک جہانگیر اس کی سنے بغیر بول رہے تھے۔
"واٹ میرا رشتہ۔ اوہ نو۔" وہ تقریباً" چیخنے والے

انداز میں بولا۔

"میں خود اپنی مرضی اور پسند سے شادی کروں گا۔"
کچھ دیر ٹھہر کر وہ اپنے مخصوص ضدی انداز میں بولا۔

"میں نے تمہارے لیے جو لڑکی پسند کی ہے اسے خود پاکستان آکر دیکھ لو۔۔۔ میں پوری گارنٹی سے کہتا ہوں تم انکار نہیں کرو گے۔ احمد سیال کی بیٹی ہے وہ۔" ملک جہانگیر نے بمشکل تمام اپنے غصے پہ قابو پایا۔ انہیں معاذ کی طرف سے پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا کہ شاید ہی وہ ان کی مانے اور اس نے سب شرم لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کے خدشے کو حقیقت کے روپ میں ڈھال دیا۔

"بابا جان میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔" ان کے لہجے میں غصہ محسوس کر کے وہ تھوڑا نرم پڑ گیا۔

"ابیک بھی میرے پاس بیٹھا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں اس سے شادی کی بات ہی کر رہا تھا۔ احمد سیال میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ اچھے خاندان سے ہے۔ احمد سیال کا اپنا ایک نام ہے' شخصیت ہے' اس کی بیٹی کے لیے کوئی رشتوں کی کمی نہیں ہے، جو وہ انتظار کریں گے۔"

"بابا جان ابھی پورا ایک سال باقی ہے میری تعلیم مکمل ہونے میں اور احمد سیال انکل کی بیٹی یقیناً" بہت اچھی ہو گی۔ ایک سال میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔"

فون کے دوسری طرف موجود ہزاروں میل دور بیٹھے معاذ کی آنکھیں اپنی چالاکی پہ چمک رہی تھیں۔

"ہاں بولو۔"

"بابا جان اچھی لڑکیوں کو زیادہ دیر اچھے رشتے کے لیے انتظار میں بیٹھنا نہیں پڑتا۔ مجھے آنے میں پورا ایک سال باقی ہے۔ اس عرصے میں احمد سیال انکل یقیناً" میرا انتظار نہیں کریں گے۔ کہیں نہ کہیں رشتہ طے کر دیں گے۔ مگر آپ ان کی بیٹی کی اتنی تعریف کر رہے ہیں تو میرا مشورہ یہ ہی کہ آپ ابیک بھائی کی شادی اس کے ساتھ کر دیں۔ اسی بہانے میں بھی آجاؤں گا۔"

فون پہ ملک جہانگیر کی گرفت اچانک ہی سخت ہوئی تھی۔ وہ اس کی بات کے جواب میں خاموش تھے' بس ان کی سانسوں کی آواز ہی معاذ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

اپنی چالاکی سے اس نے پوری صورت حال اپنے حق میں کر لی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ بابا جان کے دل پہ اس وقت کیا گزر رہی ہے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)